رجسٹر ایل نمبر ۵۳۳۰

جلد ۵۳ عدد ۳

Dec 1959

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵ - اے ذیلدار پارک ، اچھرہ - لاہور پاکستان

سالانہ چندہ ٦ روپے

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

ایک اہم اعلان

★

ہم یہ اعلان کرتے ہوئے دلی مسرت محسوس کرتے ہیں کہ جناب مولینا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ایک باقاعدہ معاہدہ کے ذریعہ سرورق صفحہ ۳ پر درج اپنی ساری تصنیفات کی طباعت اور اشاعت، تقسیم اور تجارت کے جملہ حقوق ہمیں دیدیئے ہیں اور ہم نے خدا کے فضل سے ان کتابوں کی طباعت کا کام شروع بھی کر دیا ہے اور حسب ذیل کتب طبع ہو کر آگئی ہیں:

۱۔ رسالہ دینیات (اردو)	از سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ توحید و رسالت اور زندگی بعد موت کا عقلی ثبوت	"
۳۔ سلامتی کا راستہ	"
۴۔ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر	"
۵۔ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل	"
۶-۹ نبیوں کے حالات، حصہ اول، دوم، سوم، چہارم	از مولینا ابوسلیم محمد عبدالحی
۱۰-۱۲ اخلاقی کہانیاں " " "	از مولینا افضل حسین ایم۔اے ایل۔ٹی

نیز حسب ذیل کتب اسوقت زیر طبع ہیں اور یہ بھی انشاءاللہ جنوری ۱۹۶۱ء کے وسط تک طبع ہو جائینگی

۱۔ خطبات	از سید ابوالاعلیٰ مودودی
۲۔ اسلام اور جدید معاشی نظریات	"
۳۔ ٹوورڈس انڈر اسٹینڈنگ اسلام (رسالہ دینیات کا انگریزی ترجمہ) از پروفیسر خورشید احمد، ایم اے ایل ایل۔بی	
۴۔ داعیٔ اسلام کی حیات طیبہ	از مولینا ابوسلیم محمد عبدالحی
۵۔ اصلاح معاشرہ میں نماز کا مقام	از چوہدری بہادل خان نگرہ

المشتہر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ (کراچی) برانچ: بیسہ اخبار سٹریٹ انارکلی - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۵۳	بابت ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء	عدد ۳

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ،

لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

تغیر یا انقلاب کی عام طور پر دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو آتش فشاں دھماکوں کے ساتھ آتا ہے۔ بڑی تندی اور تیزی کے ساتھ اٹھتا ہے اور پھر پوری قوت اور طاقت کے ساتھ پھیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اندھے دیکھتے، بہرے سنتے اور انجان سے انجان آدمی جانتے ہیں۔ اس سے پوری دھرتی ہلتی ہے، خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ اس کی ہلاکت خیزیوں اور فتنہ سامانیوں کے گھر گھر تذکرے ہوتے ہیں۔ اس کی بڑھتی ہوئی یلغار کو دیکھ کر سارے انسانوں کے اندر ایک شدید اضطراب اور ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ انقلاب کی یہ قسم بلاشبہ بڑی خطرناک ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرر رساں اور مہیب انقلاب کی وہ قسم ہے جو گھن کی طرح اندر ہی اندر قوموں کو کھاجاتی ہے، جو ایک خاموش آندھی کی طرح لوگوں کے دل کی بستیاں زیر وزبر کرتی ہے، افکار ونظریات کے چمنستانوں میں چل کر انہیں ویرانے بنادیتی ہے، مقدس جذبات اور پاکیزہ احساسات کی لہلہاتی کھیتیوں کو لق ودق صحراؤں میں تبدیل کرتی ہے یا آتش خاموش کی طرح لوگوں کے خرمن ایمان کو جلاکر خاکستر کردیتی ہے مگر انہیں خبر تک نہیں ہونے پاتی اور وہ آخر وقت تک اسی غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اُن کا کوئی زیاں نہیں ہو رہا بلکہ ان کے دینی سرمایے میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے

مسلمانوں کو گزشتہ دو سو برس میں انقلاب کی انہی دونوں قسموں سے سابقہ پیش آیا ہے پہلی قسم کے انقلاب سے ان کے ممالک تاخت وتاراج ہوئے، ان کے نوجوان موت کے گھاٹ اتارے گئے، ان کی عورتیں ذلیل ورسوا ہوئیں، ان کی آبرو لٹی اور ان کی عفت چھنی۔ ان کے امراء اور شرفاء کو ذلت کی اس حد تک پہنچا یا گیا جس کے بعد کوئی دوسری حد نہیں ہوتی۔ ان کے اندر الحاد اور بے دینی کو پھیلانے کی کوششیں کی گئیں اس انقلاب سے بے شک اس قوم کے اندر زبردست تباہی اور بربادی آئی مگر یہ بربادی کوئی

دبے پاؤں نہ آئی جسے کوئی جان نہ سکتا۔ یہ بربادی کپکپا دینے والی اور عقل و خرد کو مبہوت کر دینے والی گرج کے ساتھ آئی جس کے زلزلہ انگیز دھاکوں سے پہاڑوں کی چوٹیاں ہل گئیں۔ اسے سن کر ہر صاحب ایمان ہراساں اور پریشاں ہوا اور اس نے کسی نہ کسی طرح اس کو روکنے کی کوشش کی۔

لیکن اس انقلاب سے کہیں زیادہ گہرا، کہیں زیادہ خوفناک اور کہیں زیادہ ہلاکت خیز وہ انقلاب تھا جو دبے پاؤں آیا جسے حساس سے حساس کان بھی مشکل سے سن سکے اور تیز سے تیز نگاہ بھی مشکل سے بھانپ سکی۔ اس انقلاب نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا اور مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی بجائے مسلمانوں کے دل و دماغ اس طرح بدل دیئے کہ وہ اپنی بستیوں کو خود اجاڑنے لگے۔ بظاہر اس نے لوگوں کے دین و ایمان پر ڈاکہ نہ ڈالا مگر اندر ہی اندر سے اسے بالکل کھوکھلا کر کے رکھ دیا۔ اس کا اثر ان قلوب پر ہوا جو اگرچہ سعادت و نجات کی راہ اسلام کو ہی سمجھتے تھے اور اس پر سختی سے کاربند بھی تھے مگر وہ اپنے اسلام کو الحاد کی دستبرد سے پوری طرح بچا نہ سکے۔ اور ان کی مہر جدِ ایمانیات میں زندقہ اس طرح آہستہ آہستہ گھستا گیا اور اس کا زہر ان کے معتقدات کے رگ و پے میں اس خاموشی کے ساتھ سرایت کرتا چلا گیا کہ آج اگر ان کے مذہبی اصولوں کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ جس چیز کو وہ حضرات اسلام کا نام دیتے ہیں اُسے اسلام سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ زمین کو آسمان سے۔ ان لوگوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان کا مقصد وحید یہ ہے کہ اسلام کے اصولوں کو اپنی عقل کے مطابق یا زیادہ سے زیادہ حکمائے یورپ کے افکار کے مطابق ڈھالا جائے۔ یہ لوگ اپنی اس سعی کو خدمت اسلام سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام اور کفر کی آمیزش سے ایک ایسا معجون مرکب تیار کر رہے ہیں جس میں اگرچہ کچھ اجزا اسلام کے بھی ہیں مگر اس کی تاثیر بالکل غیر اسلامی ہے۔ ان صفحات میں ان لوگوں کے سارے معتقدات کا جائزہ تو نہیں لیا جا سکتا۔ یہاں ہم صرف ان کے چند گوشوں کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔

مسلمان ہونے کے لیے جس کلمے کا زبان سے ادا کرنا اور دل سے اقرار کرنا ضروری ہے، وہ ہے:

* لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ"۔ اس کلمے کا پہلا جزو ایمان باللہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ہستی کو ماننے کے یہ معنی نہیں کہ ہم اسے محض ایک ایسی قوت تسلیم کر لیں جس نے کائنات کے اولین سامانات کی تخلیق کی اور اس غرض کو نہایت کامیابی سے سرانجام دینے کے بعد اب وہ خاموشی کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھے ہوئے اس ہنگامۂ خیر و شر کو دیکھ رہی ہے۔ اسلام میں خدا جبر و مقابلہ کا کوئی خارمولا نہیں بلکہ ایک حیّ و قیوم ہستی ہے جس نے نہ صرف اس کائنات کی تخلیق کی ہے بلکہ جس کا ارادہ اور مشیت اس کے ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے۔ وہی اس کی تنہا خالق، مالک، مدبّر اور حکمران ہے۔ یہ سارا کارخانۂ قدرت صرف اسی کے اشارۂ ابرو سے چل رہا ہے اس کے علاوہ یہاں کسی کو کوئی قدرت اور اختیار حاصل نہیں۔ وہ جس طرح چاہے کرے کوئی اس کی راہ روک نہیں سکتا۔ قرآن مجید میں اس موضوع پر بے شمار آیات ملتی ہیں۔ ان میں سے چند ذیل میں نقل کی جاتی ہیں:

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَاءُ وَيُثْبِتُ وَعِنْدَهٗ أُمُّ الْكِتٰبِ (۱۳: ۳۹)

اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور ام الکتاب اسی کے ہاتھ میں ہے۔

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۱۱: ۹)

بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (۵: ۱)

بیشک تیرا پروردگار جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا۔ (الفرقان ۔ ۱)

وہ ذات جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور جس نے نہ تو کسی کو بیٹا بنایا ہے اور نہ ہی اس کی سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور پھر اس کے لیے ایک اندازہ ٹھہرایا ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖ اَحَدًا (الکہف ۔ ۴)

اس کے سوا بندوں کا کوئی ولی اور سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنے فیصلوں میں شریک کرتا ہے۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی آئینہ دار ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کا صرف خالقِ اوّل ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اسی کا حکم اس کائنات کے گوشے گوشے میں کارفرما ہے۔ اور کسی کی کوئی مجال نہیں کہ اس سے سرِ مو انحراف کر سکے۔

خداوند تعالیٰ کی حاکمیت، عظمت اور قدرت کی وضاحت کے ساتھ ساتھ قرآن مجید ہمیں اس حقیقت سے بھی آشنا کرتا ہے کہ اُس عظیم ذات کا ہماری زندگی کے ساتھ ایک گہرا تعلق اور رابطہ ہے۔ وہ کوئی مجرد اصول نہیں بلکہ ایک ایسی ہستی جو ہر لمحہ اس کائنات کی نگرانی کرتی ہے:

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا اِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ (انعام - ۷)

اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بر میں جو کچھ ہے سب سے وہ واقف ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو اور زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔ (بقرہ - ۳۴)

اللہ وہ زندۂ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اُسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اُسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اُس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ اور برتر ذات ہے۔

يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ

جو زمین میں گھستا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے اور آسمان سے اترتا ہے اور جو اس میں چڑھتا ہے، سب جانتا ہے

فِيْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط وَاللّٰهُ بِمَا	اور جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے اور تم جو کچھ کرو
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ـ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	وہ اس کو دیکھتا ہے۔ آسمان اور زمین کی بادشاہی اُسی کی
وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ـ (حدید-۱)	ہے اور تمام کاموں کا مرجع وہی ہے۔

مندرجۂ بالا آیات پر پھر ایک نگاہ ڈالیے اور دیکھیے کہ قرآنِ پاک کس بلیغانہ انداز میں اس امر کی صراحت کرتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے سب خداوند تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کے پیچھے تنہا اسی کی مشیت کام کر رہی ہے اور اس میں صرف اُسی کا ارادہ کارفرما ہے۔ یہ کائنات اور اس کے ہنگامے علت و معلول کی کرشمہ سازیاں نہیں بلکہ ایک بااختیار ہستی کی منصوبہ بندیاں ہیں۔ وہی ذات ہے جس نے علت کو علت اور معلول کو معلول بنایا ہے۔ اس لیے علت و معلول کی حقیقت بھی انسان کو اس سے زیادہ کیا معلوم کہ بقول امام غزالیؒ ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔ اس کائنات میں اصل قوت اور طاقت صرف خداوند تعالیٰ کی ہے وہ اگر چاہتا ہے تو علت و معلول کی کڑیوں کو جوڑ کر انسانی سعی کو کامیاب بنا دیتا ہے اور اگر اس کا ارادہ نہیں ہوتا تو یہ سب تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں اور نتائج انسان کی منشا اور توقع کے بالکل برعکس برآمد ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔

وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ	اگر اللہ تجھے مصیبت میں ڈالے تو خود اس کے سوا کوئی
لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ	نہیں جو اس مصیبت کو ٹال دے اور اگر وہ تیرے حق میں
يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ وَهُوَ	کسی بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو پھیرنے والا
الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (یونس-۱۱)	بھی کوئی نہیں ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے
	اپنے فضل سے نوازتا ہے اور وہ درگذر کرنے والا اور رحم
	فرمانے والا ہے۔

پھر اسی حقیقت کو حضرت ہود علیہ السلام نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ اِنِّيْ	تم سب مل کر اپنی چالیں چل دیکھو اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو

تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ۔ اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (ہود ۔ ۵)	میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو ۔ بے شک میرا رب سیدھی راہ پر ہے ۔

سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کی قوت وطاقت کو اور انسانی معاملات پر اس کی کڑی نگرانی کو ان الفاظ میں ادا فرمایا گیا ہے :

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۔ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔ (۳)	کہو ، خدایا ! ملک کے مالک ! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے ۔ بھلائی تیرے اختیار میں ہے ۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے ۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے قادرِ مطلق کی جس قدرت کا ذکر کیا ہے اُس سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس کائنات میں جبریت کے قائل ہیں ۔ انسانی زندگی میں بلا شبہ جبر کا بھی ایک پہلو ضرور ہے مگر انسان کو ایک محدود حد تک اختیار بھی دیا گیا ہے تاکہ وہ اس دائرہ کے اندر رہ کر اپنی آزادی کو استعمال کر سکے ۔ انسان کی یہی آزادی دراصل اُس کے شرف کی اساس ہے اور اسی سے اُس کے اندر ایک اخلاقی احساس جنم لیتا ہے اگر یہ حس اس میں موجود نہ ہوتی تو ایک انسان اور حیوان میں قطعاً کوئی فرق نہ ہوتا ۔

ان آیات کو یہاں درج کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن مجید کی رُو سے ذاتِ باری تعالیٰ کوئی اندھا بہرا لزوم اور لگا بندھا ضابطہ نہیں بلکہ وہ ایک ایسی باشعور، علیم وخبیر اور زندہ جاوید ہستی ہے جس کے ساتھ ہمارا نہایت ہی گہرا رابطہ ہے ہم زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے معاملات سے لیکر بڑے سے بڑے مسائل تک ہر قدم پر اُس کی توجہ کے محتاج ہیں ۔ خداوند تعالیٰ محض تخیّل نہیں بلکہ ایک ذات ہے جس کے ساتھ ہمارا ذہنی اور قلبی دونوں طرح کا ہر گونہ تعلق ہونا چاہیے ۔ سورۂ الشعراء میں دیکھیے فکر وجذبہ کے کس حسین امتزاج کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام بندے اور مالک کے اس باہمی

تعلق کو بیان فرماتے ہیں۔ اور پھر اس میں یہ بھی دیکھیے کہ یہ تعلق کتنا قریبی ہے اور اس کے چشمے احساسات کی کن عمیق گہرائیوں سے ابل رہے ہیں۔

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ وَالَّذِیْ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَلِیْ خَطِیْٓئَتِیْ یَوْمَ الدِّیْنِ۔ (الشعراء۔ رکوع ۵)	(رب العالمین) جس نے مجھے پیدا کیا، پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے۔ جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔ جو مجھے موت دیگا اور پھر دوبارہ مجھ کو زندگی بخشے گا۔ اور جس سے میں امید رکھتا ہوں کہ روزِ جزا میں وہ میری خطا معاف فرما دیگا۔

خدا اور بندے کے اس باہمی رابطہ کی قرآن مجید مختلف مقامات پر مختلف طریقوں سے وضاحت فرماتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اس کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ (ق۔ ۲)	ہم نے انسان کو پیدا کیا اور جو باتیں اس کے جی میں آتی رہتی ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم اس کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر وہ اس تعلق کو یوں بیان کرتا ہے:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ۔ (۲۔ ۲۳)	اور اے نبیؐ، میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔

پھر سورۂ نمل میں ایک نہایت لطیف پیرائے میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ خالقِ کائنات ایک نہایت ہی حساس ہستی ہے جو نہ صرف ہمارے دلوں کے اسرار کو جانتی ہے بلکہ ہماری ذہنی کیفیات اور قلبی واردات سے بھی پوری طرح واقف ہے اور جب ہم مضطرب اور پریشان ہو کر اس کی طرف متوجہ

ہوتے ہیں تو وہ ہمارے اس اضطراب کو پوری طرح محسوس کرتی ہے اور اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت اسے اطمینان سے بدل دیتی ہے۔ یہاں قرآن مجید استفہامیہ انداز اختیار کرکے اس حقیقت کو یوں ذہن نشین کراتا ہے:

أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَ يَكْشِفُ السُّوءَ (النمل - ۶۲)

کون ہے جو بے قرار ہوکر پکارنے والے کی دعا سنتا ہے اور اس کی مصیبت ٹال دیتا ہے۔

قرآن مجید اور احادیث کے مختلف مجموعوں میں جو دعائیں منقول ہیں اُن پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ انسان صرف اسی کے در کا گدا، اسی کے آستاں کا سوالی، اسی کی رحمت اور بخشش کا امیدوار، اور اسی کے فضل کا محتاج ہے۔ اُس کے ساتھ ہمارا رشتہ براہِ راست مضبوط اور پائیدار ہے۔ انسان جب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مانگتا ہے تو وہ نہیں سمجھتا کہ وہ کسی بے جان تصوّر کے سامنے دستِ سوال دراز کر رہا ہے بلکہ وہ اس یقین کے ساتھ خدا کے سامنے اپنا دامن پھیلاتا ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید ہستی ہے، اس کی رحمت بے پایاں اور اس کے خزانے بے حد و حساب ہیں۔ وہ ہماری پکار کو سنتا ہے اور جو کچھ ہم اس سے طلب کرتے ہیں وہ اگر اُسے ہمارے حق میں نافع سمجھتا ہے تو اس سے ہمیں نوازتا ہے اور بسا اوقات ہماری طلب سے کہیں بڑھ کر ہمیں دیتا ہے۔ ہمارے اور اُس ذات کے درمیان جو رشتہ موجود ہے اُسے علت و معلول کی کڑیوں نے ترتیب نہیں دیا بلکہ اُس کی نوازشوں اور اس کی رحمتوں سے اس کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ آپ قرآن مجید اور حدیث کی چند دعائیں ملاحظہ فرمائیں اور دیکھیں کہ احساسِ بندگی، اطاعت اور فرمانبرداری کے علاوہ کس قدر دل آسا، خیال انگیز اور دردمندانہ کیفیت کا نام ہے جو جذبات اور درد و شوق کے امتزاج سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کو اختیار کر لینے کے بعد انسان کے اندر کس طرح اپنی شکستگی و درماندگی، عاجزی و بے چارگی، بیکسی و بے بسی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ کس جذب و شوق کے ساتھ اپنے خالق اور مالک کی طرف رجوع کرتا ہے:

رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ

اے ہمارے رب تو ہمیں وہ عطا کر جس کا اپنے رسولوں کی معرفت تو نے ہم سے وعدہ کیا ہے اور ہمیں قیامت کے

(آل عمران - ۱۱)
دن رسوا نہ کر، تو وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

اَنْتَ وَلِیُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الْغَافِرِیْنَ۔ (اعراف - ۹)
اے اللہ تو ہمارا کارساز اور مددگار ہے بس ہمیں معاف کر دے اور ہم پر رحم کر، تو سب سے اچھا بخشنے والا ہے۔

رَبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْکَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا۔ (بنی اسرائیل - ۹)
پروردگار مجھ کو جہاں بھی تو لے جا سچائی کے ساتھ لے جا اور جہاں سے بھی نکال سچائی کے ساتھ نکال اور اپنی طرف سے ایک قوت کو میرا مددگار بنا دے۔

حضور سرورِ کائنات سے جو دعائیں مروی ہیں ان کو دیکھنے سے آنکھوں کے سامنے خود بخود یہ نقشہ ابھر آتا ہے کہ خالق کا ایک عاجز بندہ اپنے قادر و قاہر مولا سے اس امید کے ساتھ مانگ رہا ہے کہ اُس کے دروازے سے آج تک کبھی کوئی ناکام نہیں گیا۔ بندہ قلبی اضطراب کے ساتھ مانگتا ہے تاکہ مالک الملک اُسے مضطرب دیکھ کر اس پر رحم فرمائیں۔ وہ اس کے سامنے سر نیاز خم کر کے اس سے طلب کرتا ہے کیونکہ اُس ذات کے علاوہ اس کائنات میں وہ کسی دوسری ہستی کو حاجت روا نہیں مانتا۔ یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ اُن تمام مناجات کو نقل کیا جاسکے۔ ہم صرف دو دعائیں نقل کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایک مومن صادق کو اپنے خالق اور مالک کے ساتھ کس قسم کا تعلق خاطر قائم کرنا چاہیے اور اس ذات کے بارے میں اُس کے احساسات اور جذبات کی کیا نوعیت ہونی چاہیے:

اللھم انک تسمع کلامی وتری مکانی و تعلم سری وعلانیتی لا یخفی علیک شیٔ من امری وانا البائس الفقیر المستغیث المستجیر الوجل المشفق المقر المعترف بذنبی اسالک مسئلۃ المسکین وابتھل الیک ابتھال المذنب الذلیل وادعوک دعاء
اے اللہ تو میری بات کو سنتا ہے اور میری جگہ کو دیکھتا ہے تو میرے پوشیدہ اور ظاہر دونوں سے واقف ہے، تجھ سے میری کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی ہیں تو مصیبت زدہ محتاج فریادی ہوں ترساں و ہراساں اور اپنے گناہ کا اقرار کرنے والا ہوں میں ایک بیکس کی طرح تیرے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہوں، اور ایک ذلیل گناہ گار کی طرح

الخائف الضّرير ودعاء من خضعت لك رقبته وفاضت لك عبرته وذلّ لك جسمه ورغم لك انفه اللهم لا تجعلني بدعائك شقيًّا وكن بي رءوفا رحيما، يا خير المسئولين ويا خير المعطين!

تیرے سامنے گڑگڑاتا ہوں اور ایک خوف زدہ اور آفت رسیدہ کی طرح تجھ سے طلب کرتا ہوں۔ وہ جس کی گردن تیرے حضور میں جھکی ہوئی ہے جس کے آنسو بہہ رہے ہیں، جو تیرے سامنے فروتنی کیے ہوئے ہے اور اپنی ناک تیرے سامنے رگڑتا ہے۔ بار الٰہا! مجھے دعا مانگنے میں ناکام نہ رکھ اور میرے حق میں رحمت اور شفقت اختیار کر، اے اُن سب سے بہتر جن سے مانگا جائے اور عطا کرنے والوں میں سب سے ارفع و اعلیٰ ذات۔

اللهم اليك اشكو ضعف قوتي وقلة حيلتي وهواني على الناس يا ارحم الرّحمين الىٰ من تكلني الى عدو يتجهمني او الى قريبٍ مَلّكته امري۔ ان لم تكن ساخطا عليّ فلا ابالي غيران عافيتَك اَوسَعُ لِي۔

بار الٰہا! میں تجھی سے شکایت کرتا ہوں اپنے کمزور رہنے کی، ساز و سامان کی قلت کی اور لوگوں کی نظر میں کم وقعتی کی اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے، کسی دشمن کے کہ مجھ سے سینہ زوری کرے اور مجھے ستائے یا کسی عزیز کے کہ جس کے سپرد میرے سب کام کر دیے جائیں اگر تو ناراض نہ ہو تو مجھے کچھ پروا نہیں مگر پھر بھی تیری عافیت میں میرے لیے زیادہ فراخی ہے۔

آپ ان مناجات کو بار بار پڑھیں اور دیکھیں کہ یہ احساسات کس توکل، ورع، خشیت، عجز و انکسار اور رقتِ قلب کے آئینہ دار ہیں۔ اور پھر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیے کہ خداوند تعالیٰ سے مانگنے والا گو اپنے آپ کو اُس کے سامنے بالکل حقیر پاتا ہے مگر اس کے دل کی گہرائیوں میں اُس مالک اور خالق کی قربت کا کس قدر شدید احساس بھی موجود ہے۔ اسے اُس کی رحمت پہ کتنا زبردست بھروسا ہے۔ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ خود اپنے آقا کے سامنے کھڑا ہو کر، اس سے گڑگڑا کر مانگ رہا ہے۔ کیا اس قسم کے احساسات کسی تصور یا نظریہ یا فارمولا کے متعلق بھی پیدا ہو سکتے ہیں؟

خدا اور بندے کے باہمی تعلق کے بارے میں ہم نے اوپر جو کچھ عرض کیا ہے اُس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم قوانینِ فطرت کے اندر کوشش اور جدوجہد کو عبث اور بیکار سمجھتے ہیں اور اس بات کے خواہاں ہیں کہ مسلمان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائیں۔ نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہماری ان گزارشات کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسانوں کو زندگی کے سارے میدانوں میں جدوجہد کرنی چاہیے مگر اس سعی و جہد کے بعد ترتیبِ نتائج کے لیے مشیتِ ایزدی کی طرف بھی رجوع کرنا ازبس لازمی ہے۔ ہم یقیناً گمراہ ہونگے اگر اپنی ساری کوشش صرف علت و معلول کی کڑیاں جوڑنے میں صرف کرتے رہیں اور اس علت العلل اور اُس مسبب الاسباب سے کوئی تعلق استوار کرنے کی فکر نہ کریں جو ان کے اندر ربط پیدا کر کے ہماری سعی و جہد کو ٹھکانے لگاتا ہے یا ہماری کوششوں کو اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت ہماری نظر میں ناکام بنا دیتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کی ذات اب مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی نظر میں مجرد ایک تصور، ایک لگا بندھا اصول، ایک غیر تبدیل قانون یا علت و معلول کا ایک طلسمِ ہوشربا بن کر رہ گئی ہے۔ ہم میں سے ایک معقول تعداد ہر روز ایاک نستعین سے اس کا زبانی اقرار تو کرتی ہے لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ نہ تو خدا کی مدد پہ ہم بھروسہ رکھتے ہیں اور نہ ہی ہمارا کسی کام میں اس کی طرف سے خیر و برکت پر ایمان ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ دنیا صرف عالمِ اسباب ہے اس لیے کامیابی اور کامرانی کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ مادی اسباب و ذرائع جمع کریں۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہوں تو اس کامیابی کو اپنی قوتِ بازو اور حسنِ تدبیر کی کرشمہ سازی خیال کریں اور کہیں ناکامی ہو تو علت و معلول کی کڑیوں کا معائنہ شروع کر دیں اور اگر وہ ڈور بھی کچھ ایسی الجھی ہوئی ہو کہ سرا نہ ملے تو اس ناشدنی واقعہ کو اتفاق سے تعبیر کر کے خاموش ہو جائیں مگر کبھی اُس ذات کی طرف رجوع نہ کریں جو اس کائنات کی مالک ہے۔ بہترین اسباب و وسائل، بہترین قوتیں اور اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بہترین ذرائع فراہم کرنا بلاشبہ زندگی میں نہایت ضروری چیزیں ہیں مگر ان سے کہیں زیادہ ضروری خداوند تعالیٰ کے حضور میں سرِ نیاز خم کرنا اور اپنے آپ کو اس کے سپرد کرنا بھی ہے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ ۔۔۔ میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں یقیناً اللہ اپنے

بِالْعِبَادِ (۴۰ : ۵) بندوں کا نگراں ہے۔

اسے ہماری بدقسمتی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے ایمان باللہ کے دعوے کے باوجود خدا کے ساتھ عبودیت کا وہ رشتہ استوار نہیں کیا جو فی الواقع ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ہر وقت اسباب کی دنیا میں کھوئے رہتے ہیں یا علت و معلول کی محسوس کڑیوں کو جوڑنے میں اپنی ساری قوتیں کھپا دیتے ہیں مگر ہمیں کبھی اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ اس عالم اسباب کے پیچھے ایک اخلاقی نظام بھی کارفرما ہے۔ اور یہاں خدا کی مشیت اور ارادے کو بھی پورا پورا دخل ہے۔

آپ ذرا ان سارے پروگراموں، اسکیموں اور منصوبہ بندیوں کا جائزہ لیں جو ملک و ملت کی ترقی اور فلاح بہبود کے لیے تیار کی جارہی ہیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان میں ذرائع و وسائل کو جمع کرنے کی تو ساری مدیں موجود ہیں لیکن اگر کوئی مد خارج از بحث ہے تو وہ صرف رجوع الی اللہ ہے۔

ہمارے سامنے اس وقت اُس پانچ سالہ منصوبے کی کاپیاں پڑی ہوئی ہیں جو ہم نے اپنی قوم کا معاشی معیار بلند کرنے کے لیے تیار کیا ہے۔ اس منصوبہ میں اغراض و مقاصد سے لیکر زراعت، صنعت و تجارت اور بینکاری، قدرتی ذرائع اور آبادی الغرض ہر اُس چیز پر بڑی تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس سے کسی قوم کے وسائلِ رزق میں اضافہ ہوسکتا ہے لیکن اگر کسی پہلو کو ناقابلِ التفات سمجھا گیا ہے تو وہ اخلاقی اور روحانی پہلو ہے۔ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر ہمارے ہاں رزق کی تنگی ہے تو اس کے کچھ مادی وجوہ ہیں یعنی ہمارے ہاں لوہے اور کوئلے کی کمی ہے، ہمیں غیر ملکی زرِ مبادلہ دوسری اقوام کی نسبت کم فراہم ہوتا ہے، ہمارے ملک کی آب و ہوا ایسی ہے کہ لوگ اچھی طرح محنت و مشقت نہیں کرسکتے، ہماری پٹ سن کی قیمت دنیا کی منڈیوں میں گر رہی ہے۔ ہمارے پہاڑوں پر درخت موجود نہیں اور اس بنا پر ہر سال سیلاب آجاتے ہیں۔ ہماری آبادی بڑی سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے لہٰذا ہمیں اپنی قوم کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے ان سارے امور کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ پھر اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے جو منصوبے تیار ہوتے ہیں اُن میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے آبادی کو برتھ کنٹرول کے ذریعے روکا جائے، کوئلے کی کمی

کو بجلی کے ذریعہ پورا کیا جا سکتا ہے۔ پہاڑوں پر زیادہ سے زیادہ درخت اگانے چاہییں اور اس ملک میں جلد از جلد صنعتوں کا ایک وسیع جال پھیلانا چاہیے تاکہ غیر ملکی زرمبادلہ بچایا جا سکے۔ یہ ساری چیزیں اپنی جگہ مؤثر ہو سکتی ہیں لیکن ہم اس کے ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ خداوند تعالیٰ جس نے اسباب کی یہ دنیا پیدا کی ہے اور جس نے ہمیں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں بخشی ہیں، اسی نے تنگیٔ رزق کے کچھ اخلاقی اور روحانی وجوہ بھی بیان کیے ہیں اور ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں انہیں بھی اپنی نگاہ میں رکھنا چاہیے اور انہیں اپنے منصوبوں اور اسکیموں میں اتنی ہی اہمیت دینی چاہیے جس کے وہ حامل ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن مجید نے رزق کی تنگی کا ایک بہت بڑا سبب خداوند تعالیٰ سے غفلت اور بے تعلقی کو قرار دیا ہے:

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى (طٰہٰ: ۷)	اور جس نے میری یاد سے روگردانی کی اس کے لیے معیشت تنگ ہو جاتی ہے اور ہم اسے قیامت کے دن اندھا اٹھائیں گے۔

قرآن پاک میں جا بجا معاشی خوش حالی و فارغ البالی کا ایمان و تقویٰ کی زندگی ہی پر وعدہ فرمایا گیا ہے۔ سورہ اعراف میں ہے:

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (رکوع ۱۲)	اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی روش اختیار کرتے تو ہم ان پر آسمان اور زمین سے برکتوں کے دروازے کھول دیتے، مگر انہوں نے جھٹلایا، لہٰذا ہم نے اُن بُری کمائی کے حساب میں انہیں پکڑ لیا جو وہ سمیٹ رہے تھے۔

ایک جگہ اہل کتاب کے بارے میں خصوصیت سے ارشاد ہے کہ:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (المائدہ-۹)	اگر یہ لوگ توریت و انجیل اور جو کچھ خدا کی طرف سے آیا اس کی پوری پابندی کرتے تو اوپر اور نیچے دہر طرف سے خوب کھانے پینے کا سامان پاتے۔

سورۃ ہود کے شروع میں حضور سرورِ دوعالم کی زبان سے ارشاد ہے کہ:

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى (رکوع ۱)

اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدت تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دیگا۔

پھر اسی حقیقت کو حضرت ہود علیہ السلام کی زبان سے یوں اُجاگر کیا گیا ہے:

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ (ہود-۵)

اے میری قوم والو اپنے پروردگار سے (اپنی گزشتہ نافرمانی) کی معافی مانگ کر پھر اس کی طرف پلٹ آؤ (از سرِ نو اس کی فرمانبرداری کا تہیہ کر لو) تو وہ تم پر آسمان کے دہانے کھول دیگا اور تمہاری قوت پر مزید قوت کا اضافہ کریگا مجرموں کی طرف منہ نہ پھیرو۔

اسی طرح حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے فرماتے ہیں:

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ، يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا (نوح-۱)

اپنے پروردگار سے گناہوں کی معافی چاہو۔ وہ بڑا معاف فرمانے والا ہے (کہ معاف کر دینے کے بعد) تم پر خوب بارانِ رحمت بھیجے اور تمہارے اموال و اولاد میں ترقی دیگا اور تمہارے لیے باغ لگا دیگا اور نہریں جاری کر دیگا۔

یہ سب آیات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ اس عالمِ اسباب میں بھی قوموں کی قسمتوں کے فیصلے دنیاوی مال و متاع پر نہیں بلکہ اخلاقی بنیادوں پر کیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جو اس کائنات کا مالک اور حاکم ہے اس نے اس دنیا میں مادی وسائل کا انتظام تو کیا ہے اور ان میں علت و معلول کے محسوس رشتے بھی قائم فرمائے ہیں مگر جن قوانین کے ذریعہ وہ اس کائنات کا انتظام چلا رہا ہے وہ مادہ کے بے حس اور میکانکی ضابطے نہیں بلکہ اخلاقی اصول ہیں۔ اگر کسی قوم پر رزق تنگ کر دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ لازمی طور پر وسائل کی کمی یا سرمایہ کی قلت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ قدرتی ذرائع و وسائل کی فراوانی کے باوجود اس پر ذلت و مسکنت چھا جاتی ہے اور غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کوئی

بلند و بالا ذات مادی اسباب و نتائج سے یکسر بے پروا ہو کر کچھ دوسرے اصولوں کے تحت اس دنیا کا نظم چلا رہی ہے۔ مثلاً ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کسی ملک میں قحط پڑ جائے تو اس کا سبب بجز اس کے اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ اس کے باشندوں نے فصل کی اچھی طرح دیکھ بھال نہیں کی یا آبپاشی کا معقول انتظام نہیں کیا جا سکا۔ اس لیے جب بھی اس کی روک تھام کی ہمیں فکر لاحق ہوتی ہے تو ہماری توجہ پھر پھر کر مادی اسباب کی طرف ہی پلٹتی ہے۔ ہم چونکہ اسے معاشی کوتاہیوں کا ہی نتیجہ سمجھتے ہیں اس بنا پر اس کے تدارک کے لیے بھی لازمی طور پر معاشی تدابیر پر ہی انحصار کیا جاتا ہے۔ ہمیں کبھی بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ خشک سالی کے کچھ اخلاقی وجوہ بھی ہو سکتے ہیں اس لیے ہم ان کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتے اور ہمیشہ مادی ذرائع و وسائل کو جمع کرنے اور انہیں نئے نئے طریقوں سے استعمال کرنے میں اپنی صلاحیتیں کھپاتے ہیں۔ ہم زبان سے خواہ خدا کو مانتے رہیں لیکن فکر و عمل سے بہرحال یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ کائنات صرف مادی اسباب و وسائل کا ایک وسیع اور پیچیدہ طلسم ہے جو غیر محدود زمان و مکان میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کا اول تو کوئی خالق نہیں اور کبھی تھا بھی تو عرصہ ہوا مستعفی ہو چکا ہے (العیاذ باللہ) اور اب اس کی صرف یاد باقی رہ گئی ہے۔ ہمارا یہ طرز عمل انتہائی افسوسناک ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ انسانوں کو بسا اوقات اخلاقی عیوب اور برائیوں کی پاداش میں مختلف مصائب و شدائد میں مبتلا کیا جاتا ہے۔ مثلاً حضور سرور دو عالم نے فرمایا:

ما من قوم یظهر فیهم الزنا الا اخذوا بالسنة وما من قوم یظهر فیهم الرشا الا اخذوا بالرعب۔ رواہ احمد۔ (مشکوٰۃ کتاب الحدود)

کسی قوم میں جب زنا پھیل جاتا ہے تو اسے قحط سالی کی مصیبت میں مبتلا کیا جاتا ہے اور رشوت کی گرم بازاری ہوتی ہے تو اس پر خوف طاری کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح ہم صبح و شام دن میں کئی مرتبہ اللہ تعالیٰ کو رب العالمین کہہ کر پکارتے ہیں مگر ہمیں یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی ہمارا پالنہار ہے۔ اگر ہمارا فی الحقیقت اس کی ربوبیت پر ایمان ہوتا تو ہم مادی وسائل و اسباب جمع کرنے سے کہیں زیادہ اس کو راضی کرنے کی فکر کرتے کیونکہ رزق کی ساری کنجیاں تو اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کا رزق چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے غربت اور افلاس میں مبتلا کرتا ہے۔

تفہیم القرآن

القصص

(۲)

جب موسیٰ اپنی پوری جوانی کو پہنچ گیا اور اس کا نشوونما مکمل ہو گیا[۱۸] تو ہم نے اسے حکم اور علم عطا کیا[۱۹]، ہم نیک لوگوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔ (ایک روز) وہ شہر میں ایسے وقت داخل ہوا جبکہ اہلِ شہر

۱۸؎ یعنی جب ان کا جسمانی و ذہنی نشوونما مکمل ہو گیا۔ یہودی روایات میں اس وقت حضرت موسیٰ کی مختلف عمریں بتائی گئی ہیں۔ کسی نے ۱۸ سال لکھی ہے، کسی نے ۲۰ سال، اور کسی نے ۴۰ سال۔ بائیبل کے نئے عہد نامے میں ۴۰ سال عمر بتائی گئی ہے (اعمال، ۷: ۲۳) لیکن قرآن کسی عمر کی تصریح نہیں کرتا جس مقصد کے لیے قصہ بیان کیا جا رہا ہے اس کے لیے بس اتنا ہی جان لینا کافی ہے کہ آگے جس واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے وہ اُس زمانے کا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پورے شباب کو پہنچ چکے تھے۔

۱۹؎ حکم سے مراد ہے حکمت، دانائی، فہم و فراست اور قوتِ فیصلہ۔ اور علم سے مراد دینی اور دنیوی علوم دونوں ہیں، کیونکہ اپنے والدین کے ساتھ ربط ضبط قائم رہنے کی وجہ سے ان کو اپنے باپ دادا (حضرت یوسف، یعقوب، اسحاق اور ابراہیم علیہم السلام) کی تعلیمات سے بھی واقفیت حاصل ہو گئی، اور بادشاہِ وقت کے ہاں شاہزادے کی حیثیت سے پرورش پانے کے باعث اُن کو وہ تمام دنیوی علوم بھی حاصل ہوئے جو اُس زمانے کے اہلِ مصر میں متداول تھے۔ اس حکم اور علم کے عطیہ سے مراد نبوت کا عطیہ نہیں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ کو نبوت تو اس کے کئی سال بعد عطا فرمائی گئی، جیسا کہ آگے آ رہا ہے، اور اس سے پہلے سورۂ شعراء (آیت ۲۱) میں بھی بیان ہو چکا ہے۔

اس زمانۂ شاہزادگی کی تعلیم و تربیت کے متعلق بائیبل کی کتاب الاعمال میں بتایا گیا ہے کہ "موسیٰ نے مصریوں کے تمام علوم کی تعلیم پائی اور وہ کام اور کلام میں قوت والا تھا" (۷: ۲۲)۔ تلمود کا بیان ہے کہ موسیٰ علیہ السلام فرعون کے

غفلت میں تھے[۲۰]۔ وہاں اس نے دیکھا کہ دو آدمی لڑ رہے ہیں۔ ایک اس کی اپنی قوم کا تھا اور دوسرا اس کی دشمن قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی قوم کے آدمی نے دشمن قوم والے کے خلاف اسے مدد کے لیے پکارا۔ موسیٰ نے اس کو ایک گھونسا مارا[۲۱] اور اس کا کام تمام کر دیا۔ (یہ حرکت سرزد ہوتے ہی) موسیٰ نے کہا "یہ شیطان کی کارفرمائی ہے، وہ سخت دشمن اور کھلا گمراہ کن ہے[۲۲]۔" پھر وہ کہنے لگا "اے میرے رب،

گھر میں ایک خوبصورت جوان بن کر اٹھے۔ شاہزادوں کا سا لباس پہنتے، شاہزادوں کی طرح رہتے، اور لوگ ان کی نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ وہ اکثر جُشن کے علاقے میں جاتے۔ جہاں اسرائیلیوں کی بستیاں تھیں، اور ان تمام سختیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو ان کی قوم کے ساتھ قبطی حکومت کے ملازمین کرتے تھے۔ انہی کی کوشش سے فرعون نے اسرائیلیوں کے لیے ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی مقرر کی۔ انہوں نے فرعون سے کہا کہ دائماً مسلسل کام کرنے کی وجہ سے یہ لوگ کمزور ہو جائیں گے اور حکومت ہی کے کام کا نقصان ہو گا۔ ان کی قوت بحال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں ہفتے میں ایک دن آرام کا دیا جائے۔ اسی طرح اپنی دانائی سے انھوں نے اور بہت سے ایسے کام کیے جن کی وجہ سے تمام ملک مصر میں ان کی شہرت ہو گئی تھی۔ (اقتباسات تلمود، صفحہ ۱۲۹)

۲۰۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صبح سویرے کا وقت ہو، یا گرمی میں دوپہر کا، یا سردیوں میں رات کا۔ بہرحال مراد یہ ہے کہ جب سڑکیں سنسان تھیں اور شہر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔

"شہر میں داخل ہوا"، ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دارالسلطنت کے شاہی محلات عام آبادی سے باہر واقع تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام چونکہ شاہی محل میں رہتے تھے اس لیے "شہر میں نکلے" کہنے کے بجائے "شہر میں داخل ہوئے" فرمایا گیا ہے۔

۲۱۔ اصل میں لفظ "وکز" استعمال ہوا ہے جس کے معنی تھپڑ مارنے کے بھی ہیں اور گھونسا مارنے کے بھی۔ ہم نے اس خیال سے کہ تھپڑ سے موت واقع ہو جانا گھونسے کی بہ نسبت بعید تر ہے، اس کا ترجمہ گھونسا مارنا کیا ہے۔

۲۲۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ گھونسا کھا کر جب مصری گرا ہو گا اور اس نے دم توڑ دیا ہو گا تو کیسی سخت ندامت اور گھبراہٹ کی حالت میں یہ الفاظ حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلے ہوں گے۔ ان کا کوئی ارادہ قتل کا نہ تھا۔ نہ قتل کے لیے گھونسا مارا جاتا ہے۔ نہ کوئی شخص یہ توقع رکھتا ہے کہ ایک گھونسا کھاتے ہی ایک بھلا چنگا آدمی

میں نے اپنے نفس پر ظلم کر ڈالا، میری مغفرت فرما دے[۲۳]" چنانچہ اللہ نے اس کی مغفرت فرما دی، وہ غفور رحیم ہے[۲۴]۔ موسیٰ نے عہد کیا کہ "اے میرے رب یہ احسان جو تو نے مجھ پر کیا ہے[۲۵] اس کے بعد اب میں کبھی مجرموں کا مددگار نہ بنوں گا[۲۶]"۔

پران چھوڑ دیگا۔ اس بنا پر حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ یہ شیطان کا کوئی شریرانہ منصوبہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نے ایک بڑا فسا دکھڑا کرنے کے لیے مجھ سے یہ کام کرایا ہے تاکہ ایک اسرائیلی کی حمایت میں ایک قبطی کو مار ڈالنے کا الزام مجھ پر عائد ہو اور صرف میرے ہی خلاف نہیں بلکہ تمام بنی اسرائیل کے خلاف مصر میں ایک طوفانِ عظیم اٹھ کھڑا ہو۔ اس معاملہ میں بائیبل کا بیان قرآن سے مختلف ہے۔ وہ حضرت موسیٰ کو قتلِ عمد کا مجرم ٹھیراتی ہے۔ اس کی روایت یہ ہے کہ مصری اور اسرائیلی کو لڑتے دیکھ کر حضرت موسیٰ نے "اِدھر اُدھر نگاہ کی اور جب دیکھا کہ وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہے تو اس مصری کو جان سے مار کر اسے ریت میں چھپا دیا" (خروج ۲: ۱۲) یہی بات تلمود میں بھی بیان کی گئی ہے۔ اب یہ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل اپنے اکابر کی سیرتوں کو خود کس طرح داغدار کرتے ہیں اور قرآن کس طرح ان کی پوزیشن صاف کرتا ہے۔ عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک حکیم و دانا آدمی، جسے آگے چل کر ایک اولوالعزم پیغمبر ہونا تھا اور جسے انسان کو عدل و انصاف کا ایک عظیم الشان قانون دینا تھا، ایسا اندھا قوم پرست نہیں ہو سکتا کہ اپنی قوم کے ایک فرد سے دوسری قوم کے کسی شخص کو لڑتے دیکھ کر آپے سے باہر ہو جائے اور جان بوجھ کر اسے قتل کر ڈالے۔ ظاہر ہے کہ اسرائیلی کو مصری کے پنجے سے چھڑانے کے لیے اسے قتل کر دینا تو روا نہ ہو سکتا تھا۔

[۲۳] مغفرت کے معنی درگزر کرنے اور معاف کر دینے کے بھی ہیں، اور ستر پوشی کرنے کے بھی۔ حضرت موسیٰ کی دعا کا مطلب یہ تھا کہ میرے اس گناہ کو (جسے تو جانتا ہے کہ میں نے عمداً نہیں کیا ہے) معاف بھی فرما دے اور اس کا پردہ بھی ڈھانک دے تاکہ دشمنوں کو اس کا پتہ نہ چلے۔

[۲۴] اس کے بھی دو مطلب ہیں، اور دونوں یہاں مراد ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قصور معاف بھی فرما دیا اور حضرت موسیٰ کا پردہ بھی ڈھانک دیا، یعنی قبطی قوم کے کسی فرد اور قبطی حکومت کے کسی آدمی کا اُس وقت اُن کے آس پاس کہیں گزر نہ ہوا کہ وہ قتل کے اس واقعہ کو دیکھ لیتا۔ اس طرح حضرت موسیٰ کو خاموشی کے ساتھ موقع واردات سے نکل جانے کا موقع مل گیا۔

[۲۵] یعنی یہ احسان کہ میرا یہ فعل چھپا رہ گیا، اور دشمن قوم کے کسی فرد نے مجھ کو نہیں دیکھا، اور مجھے بچ نکلنے کا موقع مل گیا۔

دوسرے روز وہ صبح سویرے ڈرتا اور ہر طرف سے خطرہ بھانپتا ہوا شہر میں جا رہا تھا کہ یکایک

۲۶ حضرت موسیٰ کا یہ عہد بہت وسیع الفاظ میں ہے۔ اس سے مراد صرف یہی نہیں ہے کہ میں کسی مجرم فرد کا مددگار نہیں بنوں گا، بلکہ اس سے مراد یہ بھی ہے کہ میری امداد و اعانت کبھی ان لوگوں کے ساتھ نہ ہو گی جو دنیا میں ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ابن جریر اور متعدد دوسرے مفسرین نے اس کا یہ مطلب بالکل ٹھیک لیا ہے کہ اسی روز حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کی حکومت سے قطع تعلق کر لینے کا عہد کر لیا، کیونکہ وہ ایک ظالم حکومت تھی اور اس نے خدا کی زمین پر ایک مجرمانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ کسی ایمان دار آدمی کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ ایک ظالم سلطنت کا کل پرزہ بن کر رہے اور اس کی حشمت و طاقت میں اضافے کا موجب بنے۔

علماء اسلام نے بالعموم حضرت موسیٰ کے اس عہد سے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک مومن کو ظالم کی اعانت سے کامل اجتناب کرنا چاہیے، خواہ وہ ظالم فرد ہو، یا گروہ، یا حکومت و سلطنت۔ مشہور تابعی حضرت عطاء بن ابی رباح سے ایک صاحب نے عرض کیا کہ میرا بھائی بنی امیہ کی حکومت میں کوفے کے گورنر کا کاتب (سکرٹری) ہے۔ معاملات کے فیصلے کرنا اس کا کام نہیں ہے۔ البتہ جو فیصلے کیے جاتے ہیں وہ اس کے قلم سے جاری ہوتے ہیں۔ یہ نوکری وہ نہ کرے تو مفلس ہو جائے۔ حضرت عطاء نے جواب میں یہی آیت پڑھی اور فرمایا تیرے بھائی کو چاہیے کہ اپنا قلم پھینک دے، رزق دینے والا اللہ ہے۔

ایک اور کاتب نے عامر شعبی سے پوچھا "اے ابو عمرو، میں بس احکام لکھ کر جاری کرنے کا ذمہ دار ہوں، فیصلے کرنے کا ذمہ دار نہیں ہوں، کیا یہ رزق میرے لیے جائز ہے؟" انہوں نے کہا "ہو سکتا ہے کہ کسی بے گناہ کے قتل کا فیصلہ کیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کا مال ناحق ضبط کیا جائے۔ یا کسی کا گھر گرانے کا حکم دیا جائے اور وہ تمہارے قلم سے جاری ہو۔" پھر امام موصوف نے یہ آیت پڑھی جسے سنتے ہی کاتب نے کہا "آج کے بعد میرا قلم بنی امیہ کے احکام جاری کرنے میں استعمال نہ ہو گا۔" امام نے کہا "پھر اللہ بھی تمہیں رزق سے محروم نہ فرمائے گا۔"

ضحاک کو تو عبدالرحمٰن بن مسلم نے صرف اس خدمت پر بھیجنا چاہا تھا کہ وہ بخارا کے لوگوں کی تنخواہیں جا کر بانٹ آئیں، مگر انھوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں نے کہا آخر اس میں کیا حرج ہے۔ انھوں نے کہا میں ظالموں کے

کیا دیکھتا ہے کہ وہی شخص جس نے کل اسے مدد کے لیے پکارا تھا آج پھر اسے پکار رہا ہے۔ موسیٰ نے کہا "تو
تو بڑا ہی بہکا ہوا آدمی ہے"۔[۲۷] پھر جب موسیٰ نے ارادہ کیا کہ دشمن قوم کے آدمی پر حملہ کرے[۲۸] تو وہ پکار اٹھا[۲۹]
"اے موسیٰ کیا آج تو مجھے اسی طرح قتل کرنے لگا ہے جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے۔ تو اس ملک
میں جبّار بن کر رہنا چاہتا ہے، اصلاح کرنا نہیں چاہتا"۔ اس کے بعد ایک آدمی شہر کے پرلے سرے سے دوڑتا ہوا[۳۰]

کسی کام میں بھی مددگار نہیں بننا چاہتا (روح المعانی، ج ۲۰، ص ۴۹)

امام ابو حنیفہ کا یہ واقعہ ان کے تمام مستند سوانح نگاروں، الموفق المکی، ابن البزاز الکردری، ملا علی قاری وغیرہم نے لکھا ہے کہ انہی کی تلقین پر منصور کے کمانڈر انچیف حسن بن قحطبہ نے یہ کہہ کر اپنے عہدے سے استعفا دیدیا تھا کہ آج تک میں نے آپ کی سلطنت کی حمایت کے لیے جو کچھ کیا ہے یہ اگر خدا کی راہ میں تھا تو میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے لیکن اگر یہ ظلم کی راہ میں تھا تو میں اپنے نامۂ اعمال میں مزید جرائم کا اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

۲۷؎ یعنی تو جھگڑالو آدمی معلوم ہوتا ہے۔ روز تیرا کسی نہ کسی سے جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ کل ایک شخص سے بھڑ گیا تھا، آج ایک دوسرے شخص سے جا بھڑا۔

۲۸؎ بائیبل کا بیان یہاں قرآن کے بیان سے مختلف ہے۔ بائیبل کہتی ہے کہ دوسرے دن کا جھگڑا دو اسرائیلیوں کے درمیان تھا، لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ جھگڑا بھی اسرائیلی اور مصری کے درمیان ہی تھا۔ قرین قیاس یہی دوسرا بیان معلوم ہوتا ہے، کیونکہ پہلے دن کے قتل کا راز فاش ہونے کی جو صورت آگے بیان ہو رہی ہے وہ اسی طرح رونما ہو سکتی ہے کہ مصری قوم کے ایک شخص کو اس واقعہ کی خبر ہو جائے۔ ایک اسرائیلی کے علم میں اس کے آجانے سے یہ امکان کم تھا کہ اپنی قوم کے پشتیبان شہزادے کے اتنے بڑے قصور کی اطلاع پاتے ہی وہ جا کر فرعونی حکومت میں اس کی مخبری کر دیتا۔

۲۹؎ یہ پکارنے والا وہی اسرائیلی تھا جس کی مدد کے لیے حضرت موسیٰ آگے بڑھے تھے۔ اس کو ڈانٹنے کے بعد جب آپ مصری کو مارنے کے لیے چلے تو اس اسرائیلی نے سمجھا کہ یہ مجھے مارنے آرہے ہیں، اس لیے اس نے چیخنا شروع کر دیا اور اپنی حماقت سے کل کے قتل کا راز فاش کر ڈالا۔

۳۰؎ یعنی اس دوسرے جھگڑے میں جب قتل کا راز فاش ہو گیا اور اس مصری نے جا کر مخبری کر دی تب یہ واقعہ پیش آیا۔

آیا اور بولا "موسیٰ! سرداروں میں تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، یہاں سے نکل جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں"۔
ع یہ خبر سنتے ہی موسیٰ ڈرتا اور سہمتا نکل کھڑا ہوا اور اس نے دعا کی کہ "اے میرے رب، مجھے ظالموں سے بچا"۔

(مصر سے نکل کر) جب موسیٰ نے مدین کا رُخ کیا[۳۱] تو اس نے کہا "امید ہے کہ میرا رب مجھے ٹھیک راستے پر ڈال دے گا"[۳۲]۔ اور جب وہ مدین کے کنوئیں پر پہنچا[۳۳] تو اس نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اپنے جانوروں کو

---

[۳۱] بائیبل کا بیان اس امر میں قرآن سے متفق ہے کہ حضرت موسیٰ نے مصر سے نکل کر مدین کا رُخ کیا تھا لیکن تلمود یہ بے سروپا قصہ بیان کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ مصر سے بھاگ کر حبش چلے گئے، اور وہاں بادشاہ کے مقرب ہو گئے۔ پھر اس کے مرنے پر لوگوں نے ان کو اپنا بادشاہ بنا لیا اور اُس کی بیوہ سے ان کی شادی کر دی۔ ۴۰ سال انہوں نے وہاں حکومت کی۔ مگر اس پوری مدت میں اپنی حبشی بیوی سے کبھی مقاربت نہ کی۔ ۴۰ سال گزر جانے کے بعد اس عورت نے حبش کے باشندوں سے شکایت کی کہ اس شخص نے آج تک نہ تو مجھ سے زن و شو کا تعلق رکھا ہے اور نہ کبھی حبش کے دیوتاؤں کی پرستش کی ہے۔ اس پر امرائے سلطنت نے انہیں معزول کر کے اور بہت سا مال دے کر ملک سے باحترام رخصت کر دیا۔ تب وہ حبش سے مدین پہنچے اور وہ واقعات پیش آئے جو آگے بیان ہو رہے ہیں۔ اس وقت ان کی عمر ۶۷ سال تھی۔

اس قصے کے بے سروپا ہونے کی ایک کھلی ہوئی دلیل یہ ہے کہ اسی قصے میں یہ بھی بیان ہوا ہے کہ اُس زمانے میں اسیریا (شمالی عراق) پر حبش کی حکومت تھی، اور اسیریا والوں کی بغاوتیں کچلنے کے لیے حضرت موسیٰ نے بھی اور ان کے پیش رو بادشاہ نے بھی فوجی چڑھائیاں کی تھیں۔ اب جو شخص بھی تاریخ و جغرافیہ سے سرسری واقفیت رکھتا ہو وہ نقشے پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھ سکتا ہے کہ اسیریا پر حبش کا تسلط اور حبشی فوج کا حملہ یا تو اس صورت میں ہو سکتا تھا کہ مصر اور فلسطین و شام پر اس کا قبضہ ہوتا، یا پورا ملکِ عرب اس کے زیرِ نگیں ہوتا، یا پھر حبش کا بیڑا ایسا زبردست ہوتا کہ وہ بحرِ ہند اور خلیج فارس کو عبور کر کے عراق فتح کر لیتا۔ تاریخ اس ذکر سے خالی ہے کہ کبھی حبشیوں کو ان ممالک پر تسلط حاصل ہوا ہو یا ان کی بحری طاقت اتنی زبردست رہی ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا علم خود اپنی تاریخ کے بارے میں کتنا ناقص تھا اور قرآن ان کی غلطیوں کی تصحیح کر کے صحیح واقعات کیسی منقح صورت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن عیسائی اور یہودی مستشرقین کو یہ کہتے ذرا شرم نہیں آتی کہ قرآن نے یہ قصے بنی اسرائیل سے

پانی پلا رہے ہیں اور ان سے الگ ایک طرف دو عورتیں اپنے جانوروں کو روک رہی ہیں۔ موسیٰ نے ان عورتوں سے پوچھا "تمہیں کیا پریشانی ہے؟" انہوں نے کہا "ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتیں جب تک یہ چرواہے اپنے جانور نہ نکال لے جائیں، اور ہمارے والد ایک بہت بوڑھے آدمی ہیں"[۳۴] یہ سن کر موسیٰ نے

نقل کر رہے ہیں۔

۳۲ یعنی ایسے راستہ پر جس سے میں بخیریت مدین پہنچ جاؤں۔

واضح رہے کہ اُس زمانہ میں مَدیَن فرعون کی سلطنت سے باہر تھا۔ مصر کی حکومت پورے جزیرہ نمائے سینا پر نہ تھی، بلکہ صرف اس کے مغربی اور جنوبی علاقے تک محدود تھی۔ خلیج عَقَبہ کے مشرقی اور مغربی سواحل، جن پر بنی مدیانؑ آباد تھے، مصری اثر و اقتدار سے بالکل آزاد تھے۔ اِسی بنا پر حضرت موسیٰ نے مصر سے نکلتے ہی مدین کا رُخ کیا تھا، کیونکہ قریب ترین آزاد اور آباد علاقہ وہی تھا۔ لیکن وہاں جانے کے لیے انہیں گزرنا بہرحال مصر کے مقبوضہ علاقوں ہی سے تھا، اور مصر کی پولیس اور فوجی چوکیوں سے بچ کر نکلنا تھا۔ اسی لیے انہوں نے اللہ سے دعا کی کہ مجھے ایسے راستے پر ڈال دے جس سے میں صحیح و سلامت مدین پہنچ جاؤں۔

۳۳ یہ مقام جہاں حضرت موسیٰ پہنچے تھے، عربی روایات کے مطابق خلیج عقبہ کے عربی ساحل پر مَقنا کے قریب واقع تھا۔ آج کل اُسے مَغَایِرِ شُعَیب کہتے ہیں اور اس علاقے کے لوگ اُس کنوئیں کی نشان دہی بھی کرتے ہیں جس سے حضرت موسیٰ نے بکریوں کو پانی پلایا تھا۔

۳۴ یعنی ہم عورتیں ہیں، اِن چرواہوں سے مزاحمت اور کشمکش کر کے اپنے جانوروں کو پانی پلانا ہمارے بس میں نہیں ہے۔ والد ہمارے اس قدر سن رسیدہ ہیں کہ وہ خود یہ مشقت اٹھا نہیں سکتے۔ گھر میں کوئی دوسرا مرد بھی نہیں ہے۔ اس لیے ہم عورتیں ہی یہ کام کرنے نکلتی ہیں اور جب تک سب چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے نہیں جاتے، ہم کو مجبوراً انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس سارے مضمون کو ان خواتین نے صرف ایک مختصر سے فقرے میں ادا کر دیا، جس سے ان کی حیاداری کا اندازہ ہوتا ہے کہ ایک غیر مرد سے زیادہ بات بھی نہ کرنا چاہتی تھیں، مگر یہ بھی پسند نہ کرتی تھیں کہ یہ اجنبی ہمارے خاندان کے متعلق کوئی غلط رائے قائم کر لے اور اپنے ذہن میں یہ خیال کرے کہ کیسے لوگ ہیں جن کے مرد گھر بیٹھے رہے اور اپنی عورتوں کو اس کام کے لیے باہر بھیج دیا۔

ان کے جانوروں کو پانی پلا دیا، پھر ایک سائے کی جگہ جا بیٹھا اور بولا "پروردگار، جو خیر بھی تو مجھ پر نازل

ان خواتین کے والد کے متعلق ہمارے ہاں کی روایات میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ لیکن قرآن مجید میں اشارۃً و کنایۃً بھی کوئی بات ایسی نہیں کہی گئی ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ وہ حضرت شعیب ہی تھے۔ حالانکہ شعیب علیہ السلام کی شخصیت قرآن میں ایک معروف شخصیت ہے۔ اگر ان خواتین کے والد وہی ہوتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ یہاں اس کی تصریح نہ کر دی جاتی۔ بلاشبہ بعض احادیث میں ان کے نام کی تصریح ملتی ہے، لیکن علامہ ابن جریر اور ابنِ کثیر دونوں اس پر متفق ہیں کہ ان میں سے کسی کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ اسی لیے ابن عباس، حسن بصری، ابو عبیدہ اور سعید بن جُبیر جیسے اکابر مفسرین نے بنی اسرائیل کی روایات پر اعتماد کر کے ان بزرگ کے وہی نام بتائے ہیں جو تلمود وغیرہ میں آئے ہیں۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اسمِ شُعَیب کی تصریح ثابت ہوتی تو یہ حضرات کوئی دوسرا نام نہ لے سکتے تھے۔

بائیبل میں ایک جگہ ان بزرگ کا نام رعوایل اور دوسری جگہ یَتْرو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ مدین کے کاہن تھے۔ (خروج باب ۲: ۱۶-۱۸۔ باب ۳: ۱۔ باب ۱۸: ۵) تلمودی لٹریچر میں رعوایل، یتھرو اور حوباب تین مختلف نام بتائے گئے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علمائے یہود کا خیال ہے کہ یتھرو ہِزاکسی لنسی کا ہم معنی لقب تھا اور اصل نام رعوایل یا حوباب تھا۔ اسی طرح لفظ کاہن (KOHEN MIDIAN) کی تشریح میں بھی علماء یہود کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض اس کو پروہت (PRIEST) کا ہم معنی بتاتے ہیں اور بعض رئیس یا امیر (PRINCE) کا۔

تلمود میں ان کے جو حالات بیان کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ حضرت موسیٰ کی پیدائش سے پہلے فرعون کے ہاں ان کی آمد و رفت تھی اور وہ ان کے علم اور اصابت رائے پر اعتماد رکھتا تھا۔ مگر جب بنی اسرائیل کا استیصال کرنے کے لیے مصر کی شاہی کونسل میں مشورے ہونے لگے اور ان کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا فیصلہ کیا گیا تو انہوں نے فرعون کو اس غلط کام سے روکنے کی کوشش کی، اسے اس ظلم کے بُرے نتائج سے ڈرایا اور رائے دی کہ اگر ان لوگوں کا وجود آپ کے لیے ناقابل برداشت ہے تو انہیں ان کے باپ دادا کے ملک کنعان کی طرف نکال دیجیے۔ اس پر فرعون ان سے ناراض ہو گیا اور اس نے انہیں ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔ اس وقت سے

کر دے میں اس کا محتاج ہوں"۔ (کچھ دیر نہ گزری تھی کہ) ان دونوں عورتوں میں سے ایک شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی اور کہنے لگی[۳۵] "میرے والد آپ کو بلا رہے ہیں تاکہ آپ نے ہمارے لیے جانوروں کو پانی جو پلایا ہے اس کا اجر آپ کو دیں[۳۶]"۔ موسیٰ جب اس کے پاس پہنچا اور اپنا سارا قصہ اسے سنایا تو اس نے کہا

وہ اپنے ملک مدین ہی میں اقامت گزیں ہو گئے تھے۔

ان کے مذہب کے متعلق قیاس یہی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح وہ بھی دین ابراہیمی کے پیرو تھے کیونکہ جس طرح حضرت موسیٰ اسحاق بن ابراہیم (علیہما السلام) کی اولاد تھے اسی طرح وہ مدیان بن ابراہیم کی اولاد میں سے تھے۔ یہی تعلق غالباً اس کا موجب ہوا ہو گا کہ انہوں نے فرعون کو بنی اسرائیل پر ظلم کرنے سے روکا اور اس کی ناراضی مول لی۔ مفسر نیشاپوری نے حضرت حسن بصری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انہ کان رجلا مسلما قبل الدین من شعیب (وہ ایک مسلمان آدمی تھے، حضرت شعیب کا دین انہوں نے قبول کر لیا تھا)۔ تلمود میں بیان کیا گیا ہے کہ وہ مدیانیوں کی بت پرستی کو علانیہ حماقت قرار دیتے تھے، اس وجہ سے اہل مدین ان کے مخالف ہو گئے تھے۔

۳۵ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس فقرے کی یہ تشریح کی ہے: جاءت تمشی علی استحیاء قائلۃ بثوبہا علی وجہہا لیست بسلفع من النساء ولاجۃ خراجۃ "وہ شرم و حیا کے ساتھ چلتی ہوئی اپنا منہ گھونگھٹ سے چھپائے ہوئے آئی۔ اُن بے باک عورتوں کی طرح دراتہ نہیں چلی آئی جو ہر طرف نکل جاتی اور ہر جگہ جا گھستی ہیں"۔ اس مضمون کی متعدد روایات سعید بن منصور، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابن المنذر نے معتبر سندوں کے ساتھ حضرت عمر سے نقل کی ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام کے عہد میں حیاداری کا اسلامی تصور، جو قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تربیت سے ان بزرگوں نے سمجھا تھا، چہرے کو اجنبیوں کے سامنے کھولے پھرنے اور گھر سے باہر بے باکانہ چلت پھرت دکھانے کے قطعاً خلاف تھا۔

۳۶ یہ بات بھی شرم و حیا ہی کی وجہ سے انہوں نے کہی، کیونکہ ایک غیر مرد کے پاس اکیلی جگہ آنے کی کوئی معقول وجہ بتانی ضروری تھی۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ایک شریف آدمی نے اگر عورت ذات کو پریشانی میں مبتلا دیکھ کر اس کی کوئی مدد کی ہو تو اس کا بدلا دینے کے لیے کہنا کوئی اچھی بات نہ تھی۔ اور پھر اس بدلے کا نام سن لینے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عالی ظرف انسان کا چل پڑنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس وقت انتہائی اضطرار کی حالت میں تھے۔ بے سر و سامانی کے

کچھ ڈر نہیں، اب تم ظالم لوگوں سے بچ نکلے ہو۔"

ان دونوں عورتوں میں سے ایک نے اپنے باپ سے کہا "ابّا جان، اس شخص کو نوکر رکھ لیجیے، بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔"[۳۸] اس کے باپ نے (موسیٰ سے) کہا[۳۹] میں

عالم میں یکایک مصر سے نکل کھڑے ہوئے تھے۔ مدین تک کم از کم آٹھ دن میں پہنچے ہوں گے۔ بھوک پیاس اور سفر کی تکان سے بُرا حال ہوگا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ فکر ہوگی کہ اس دیارِ غیر میں کوئی ٹھکانا میسر آئے اور کوئی ایسا ہمدرد ملے جس کی پناہ میں رہ سکیں۔ اسی مجبوری کی وجہ سے یہ لفظ سن لینے کے باوجود کہ اس ذرا سی خدمت کا اجر دینے کے لیے بلایا جا رہا ہے حضرت موسیٰ نے جانے میں تامل نہ کیا۔

۳۸؎ ضروری نہیں کہ یہ بات لڑکی نے اپنے باپ سے حضرت موسیٰ کی پہلی ملاقات کے وقت ہی کہہ دی ہو۔ اغلب یہ ہے کہ اس کے والد نے اجنبی مسافر کو ایک دو روز اپنے پاس ٹھیرا لیا ہوگا اور اس دوران میں کسی وقت بیٹی نے باپ کو یہ مشورہ دیا گیا۔ اس مشورے کا مطلب یہ تھا کہ آپ کی کبر سنی کے باعث مجبوراً ہم لڑکیوں کو کام کے لیے نکلنا پڑتا ہے۔ ہمارا کوئی بھائی نہیں ہے کہ باہر کے کام سنبھالے۔ آپ اس شخص کو ملازم رکھ لیں۔ مضبوط آدمی ہے، ہر طرح کی مشقت کر لیگا۔ اور بھروسے کے قابل آدمی ہے۔ محض اپنی شرافت کی بنا پر اس نے ہم عورتوں کو بے بس کھڑا دیکھ کر ہماری مدد کی۔ اور کبھی ہماری طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔

۳۹؎ یہ بھی ضروری نہیں کہ بیٹی کی بات سنتے ہی باپ نے فوراً حضرت موسیٰ سے یہ بات کہہ دی ہو۔ قیاس چاہتا ہے کہ انہوں نے بیٹی کے مشورے پر غور کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہوگی کہ آدمی شریف سہی، مگر جوان بیٹیوں کے گھر میں ایک جوان، تندرست و توانا آدمی کو یونہی ملازم رکھ چھوڑنا مناسب نہیں ہے۔ جب یہ شریف، تعلیم یافتہ، مہذب اور خاندانی آدمی ہے (جیسا کہ حضرت موسیٰ کا قصہ سن کر انہیں معلوم ہو چکا تھا) تو کیوں نہ اسے داماد بنا کر ہی گھر میں رکھا جائے۔ اس رائے پر پہنچنے کے بعد انہوں نے کسی مناسب وقت پر حضرت موسیٰ سے یہ بات کہی ہوگی۔

یہاں پھر بنی اسرائیل کی ایک کرم فرمائی ملاحظہ ہو جو انہوں نے اپنے جلیل القدر نبی، اپنے سب سے بڑے محسن اور قومی ہیرو پر کی ہے۔ تلمود میں کہا گیا ہے کہ "موسیٰ رعوایل کے ہاں رہنے لگے، اور وہ اپنے میزبان کی بیٹی صفورہ پر نظرِ عنایت رکھتے تھے، یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے اس سے بیاہ کر لیا۔" ایک اور یہودی روایت جو جیوش انسائکلوپیڈیا

چاہتا ہوں کہ اپنی ان دونوں بیٹیوں میں سے ایک کا نکاح تمہارے ساتھ کر دوں بشرطیکہ تم آٹھ سال تک میرے ہاں ملازمت کرو، اور اگر دس سال پورے کر دو تو یہ تمہاری مرضی ہے۔ میں تم پر سختی نہیں کرنا چاہتا۔ تم انشاءاللہ مجھے نیک آدمی پاؤ گے۔" موسیٰ نے جواب دیا "یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہو گئی۔ ان دونوں مدتوں میں سے جو بھی میں پوری کر دوں اُس پر پھر کوئی زیادتی مجھ پر نہ ہو، اور جو کچھ قول قرار ہم کر رہے ہیں اللہ اس پر نگہبان ہے۔" ع ۳

میں نقل کی گئی ہے، یہ ہے کہ "حضرت موسیٰ نے جب یتھرو کو اپنا سارا ماجرا سنایا تو اس نے سمجھ لیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھوں فرعون کی سلطنت تباہ ہونے کی پیشینگوئیاں کی گئی تھیں۔ اس لیے اس نے فوراً حضرت موسیٰ کو قید کر لیا تاکہ انہیں فرعون کے حوالہ کر کے انعام حاصل کرے۔ سات یا دس سال تک وہ اس کی قید میں رہے۔ ایک تاریک تہ خانہ تھا جس میں وہ بند تھے۔ مگر یتھرو کی بیٹی زفورا (یا صفورا) جس سے کنوئیں پر ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی چھپے چھپے ان سے قید خانے میں ملتی رہی اور انہیں کھانا پانی بھی پہنچاتی رہی۔ ان دونوں میں شادی کی خفیہ قرارداد ہو چکی تھی۔ سات یا دس سال کے بعد زفورا نے اپنے باپ سے کہا کہ اتنی مدت ہوئی آپ نے ایک شخص کو قید میں ڈال دیا تھا اور پھر اس کی خبر تک نہ لی۔ اب تک اسے مر جانا چاہیے تھا۔ لیکن اگر وہ اب بھی زندہ ہو تو ضرور کوئی خدا رسیدہ آدمی ہے۔ یتھرو اس کی یہ بات سن کر جب قید خانے میں گیا تو حضرت موسیٰ کو زندہ دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ وہ معجزے سے زندہ ہیں۔ تب اس نے زفورا سے ان کی شادی کر دی۔"

جو مغربی مستشرقین قرآنی قصوں کے مآخذ ڈھونڈتے پھرتے ہیں انہیں کہیں یہ کھلا فرق بھی نظر آتا ہے جو قرآن کے بیان اور اسرائیلی روایات میں پایا جاتا ہے؟

۳۹ ؎ بعض لوگوں نے حضرت موسیٰ اور لڑکی کے والد کی گفتگو کو نکاح کا ایجاب و قبول سمجھ لیا ہے اور یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ آیا باپ کی خدمت بیٹی کے نکاح کا مہر قرار پا سکتی ہے؟ اور کیا عقدِ نکاح میں اس طرح کی خارجی شرائط شامل ہو سکتی ہیں؟ حالانکہ آیاتِ زیرِ بحث کی عبارت سے خود ہی یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ یہ عقدِ نکاح نہ تھا بلکہ وہ ابتدائی بات چیت تھی جو نکاح سے پہلے تجویزِ نکاح کے سلسلے میں بالعموم دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ آخر یہ نکاح کا ایجاب و قبول کیسے ہو سکتا ہے جبکہ یہ تعین بھی اس میں نہ کیا گیا تھا کہ دونوں لڑکیوں میں سے کونسی نکاح میں دی جا رہی ہے

محسنِ انسانیتؐ

اور اُجالا پھیلتا ہی چلا گیا!

(از جناب نعیم صدیقی صاحب)

(بسلسلہ گذشتہ)

(۴) معاہدۂ حدیبیہ | حضورؐ کی اسلامی تحریک کی تاریخ میں معاہدۂ حدیبیہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کے نتیجے میں حالات کے دھارے نے ایک اہم ترین موڑ مڑا اور تحریک ایک ہی جست لگا کر اپنی توسیع کے عوامی دور میں داخل ہو گئی۔ محسنِ انسانیتؐ کی سیاسی بصیرت کی انتہائی معراجِ کمال اس واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ درجۂ اوّل کی معاند اور بر سرِ جنگ طاقت کو حضورؐ نے کس آسانی سے مصالحت پر تیار کر لیا اور اس کے ہاتھ کئی برس کے لیے باندھ دیئے۔

(بقیہ تفہیم القرآن)

اس گفتگو کا ماحصل تو صرف یہ تھا کہ لڑکی کے باپ نے کہا میں اپنی لڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کر دینے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ تم مجھ سے وعدہ کرو کہ آٹھ دس سال میرے ہاں رہ کر میرے گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹاؤ گے۔ کیونکہ اس رشتے سے میری اصل غرض یہی ہے کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، کوئی بیٹا میرے ہاں نہیں ہے جو میری جائداد کا انتظام سنبھالے۔ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں جنہیں مجبوراً باہر نکالتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ داماد میرا دست و بازو بن کر رہے، یہ ذمہ داری اگر تم سنبھالنے کے لیے تیار ہو اور شادی کے بعد ہی بیوی کو لیکر چلے جانے کا ارادہ نہ رکھتے ہو، تو میں اپنی ایک لڑکی کا نکاح تم سے کر دونگا۔ حضرت موسیٰ اس وقت خود ایک ٹھکانے کے طالب تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو قبول کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک معاہدے کی صورت تھی جو نکاح سے پہلے فریقین میں طے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اصل عقدِ نکاح قاعدے کے مطابق ہوا ہو گا اور اس میں مہر بھی باندھا گیا ہو گا۔ اس عقد میں خدمت کی شرط شامل ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

غداری و بغاوت کے جرم میں جلاوطن شدہ یہود نے جب خیبر، تیماء اور وادی القریٰ میں جا ڈیرا جمایا تو مدینہ بیک وقت دو محاذوں کے درمیان گھر گیا۔ قریش اور یہود کے اتحاد نے لشکر کے لشکر جمع کر کے مدینہ کے سامنے لا کھڑے کیے تھے۔ جنگِ احزاب سے بخیریت عہدہ برآ ہوتے ہوئے حضورؐ کے سامنے یہ پیچیدہ مسئلہ آ گیا کہ کیسے اس دوہرے محاذ کو توڑا جائے۔ موجودہ حالت میں مکہ کی طرف اقدام کریں تو خیبر کے یہودی اور بنو غطفان مدینہ پر چڑھائی کر سکتے تھے اور اگر خیبر کی طرف متوجہ ہوں تو قریش دھاوا بول سکتے تھے۔ یہ بھی نبی اکرمؐ کی نگاہِ دور رس کا کتنا صحیح اندازہ تھا کہ ان دونوں میں سے خیبر کا محاذ ایسا محاذ تھا جسے ایک ہلہ میں توڑا جا سکتا تھا اور اسی کے ساتھ ساتھ دونوں میں سے قریشِ مکہ ہی کو باسانی صلح پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ درحقیقت قریش کی قوت اندر سے کھوکھلی ہو چکی تھی اور اگرچہ وہ ظاہراً برابر شور اشوری دکھا رہے تھے، لیکن اب تابِ مقاومت کچھ زیادہ تھی نہیں۔ پھر مکہ اور اس کے آس پاس حضورؐ کے حامی عناصر موجود تھے جن کو آپؐ کے بعض اقدامات نے مضبوط تر کر دیا۔ حضورؐ نے قحط کے دنوں میں مکہ کو غلہ اور نقدی سے مدد دے کر وہاں کے غربا اور عوام کے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ چنانچہ ابوسفیان نے کہا بھی تھا کہ اب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے لوگوں کو ان طریقوں سے ورغلانا چاہتے ہیں۔ پھر حضورؐ نے ایک اقدام یہ بھی فرمایا کہ مکہ کے سردارِ اعلیٰ ابوسفیان کی صاحبزادی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ ازدواجی رشتہ جوڑا۔ یہ شادی بڑا اہم سیاسی نتیجہ رکھتی تھی۔ بہرحال اب کسی طریقے سے ایک نئے اقدام کی ضرورت تھی جس پر حضورؐ برابر کاوش کرتے رہے۔

ادھر ایک بڑا مسئلہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو مکہ سے بچھڑے ہوئے چھ برس ہونے کو آئے تھے۔ معاملہ محض حبِ وطن ہی کا نہ تھا بلکہ کعبہ دعوتِ ابراہیمی کا مرکز تھا اور اسی دعوتِ ابراہیمی کی تجدید اب مسلم جماعت نے کی تھی۔ اس جماعت کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے آپ کو اپنے اعتقادی مرکز سے منقطع رکھ سکے۔ قریش اب تک راستہ نہیں دے رہے تھے اور بظاہر کشمکش کا آخری فیصلہ ہونے کے لیے لمبی مدت درکار تھی۔ اس پہلو سے جذبات آہستہ آہستہ مضطرب ہو رہے تھے۔ ضرورت تھی کہ جماعتِ اسلامی کی طرف سے حرم پر اپنے حق کا اظہار ہو۔

اسی اثنا میں حضورؐ کو ایک رویائے صادقہ میں حج کرنے کا اشارہ ہوا۔ بس وہ اشارہ پاتے ہی آپؐ کی بے مثل بصیرت نے بہترین لائحہ عمل بہترین وقت میں اختیار کیا اور اسے بہترین شکل میں جامۂ عمل پہنایا۔ آپؐ نے ایک بڑی جماعت کو ساتھ لے کر حج کے حرام مہینوں میں عمرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ۱۴ سو افراد جو اپنی خوشی سے تیار ہوئے صرف ان کو ساتھ لیا۔ نُمیلہ ابن عبداللہ لیثی کو مدینہ میں نیابت سونپ کر مسلمانوں کی کافی تعداد بغرضِ حفاظت وہیں رہنے دی۔ قربانی کے ستر اونٹ ساتھ لیے۔ جنگی ہتھیار نہیں لگائے گئے۔ روانگی بڑی خاموشی سے ہوئی۔ مقامِ ذوالحلیفہ میں پہنچ کر قربانیوں کو نشان زد کیا گیا۔

یہ سفر ایک طرف مذہبی بھی تھا اور دوسری طرف اس میں بڑا زبردست سیاسی پہلو بھی از خود شامل تھا۔ دین و سیاست کا یہ ایکا تو ہمیں حضورؐ کے سارے کارنامۂ حیات میں ملتا ہے۔ پھر حج کے سفر میں دنیوی کاروبار یا سیاسی اقدامات کا شامل کرنا شرعاً بالکل روا ہے۔ سو یہ سفر قریش کے لیے ایک بھاری چیلنج بن گیا۔ اگر وہ ان زائرینِ حرم کی مزاحمت نہ کریں تو گویا مکہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے لیے کھل گیا، پھر حضورؐ اور ان کے رفقاء کے حرم میں آنے سے بہت ہی گہرے اثرات شہر والوں پر پڑ سکتے تھے کیونکہ اسلامی انقلاب کے ان داعیوں کی آمد سے پچھلی تاریخِ دعوت کے ان سارے نقوش میں جان پڑ جاتی جو ذرے ذرے پر ثبت تھے۔ عوام میں یہ چرچا بھی پھیل جاتا کہ بس اب قریش ٹائیں ٹائیں فش ہو گئے۔ چنانچہ سہیل بن عمرو (گفتگوئے مصالحت میں مکہ کا نمائندہ) نے کہہ بھی دیا تھا کہ اگر ہم آپ لوگوں کو حرم میں داخل ہونے دیں تو سارا عرب یہ کہے گا کہ ہم نے آپ کی قوت سے ڈر کر راستہ کھول دیا۔

حضورؐ کو راستے ہی میں صورتِ حالات کا علم ہو گیا تھا۔ ایک خزاعی خبر رساں بشیر بن سفیان نے مقامِ عسفان پر آکر اطلاع دی کہ قریش مزاحمت کی تیاری میں ہیں اور ان کا فیصلہ یہ ہے کہ "محمدؐ مکہ میں کبھی نہیں داخل ہو سکتے"۔ آپؐ کو روکنے کے لیے خالد سواروں کا دستہ لے کر مقامِ کُراعُ الغمیم تک آ چکا ہے۔ حضورؐ نے اس پر فرمایا: "یہ قریش کی بدبختی ہے۔ جنگوں نے ان کا کچومر نکال دیا ہے۔ ان کا کیا حرج ہے کہ وہ بیچ میں سے ہٹ جائیں اور مجھے اور باقی عرب کو نمٹ لینے دیں۔ اگر اہلِ عرب مجھے ختم کر دیں تو ان کی مراد پوری ہوئی۔ اگر مجھے غلبہ حاصل ہو جائے تو وہ چاہیں تو اپنی تعدادِ کثیر کے ساتھ اسلام میں داخل ہو جائیں، ورنہ وہ قوت

رکھتے ہیں اور اس وقت لڑیں۔ ایسا نہ ہو تو پھر خدا کی قسم میں اس حق کو لے کر جس کے ساتھ مجھے خدا نے اٹھایا ہے آخر دم تک لڑوں گا۔ یہاں تک کہ یا تو خدا اس حق کو غالب کر دے یا میری یہ گردن کٹ جائے"۔ گویا آپؐ نے مصالحت کی راہ کی طرف اشارہ بھی کر دیا، الٹی میٹم بھی دے دیا اور قریش کی پتلی حالت پر بھی توجہ دلا دی۔

لیکن دوسری طرف زائرین کے قافلے کو روکنے میں بھی قریش کی پوزیشن سخت خراب ہوتی تھی۔ رائے عام میں رَو یہ چلتی کہ ان لوگوں نے ایک مذہبی حق میں رکاوٹ ڈالی۔ لڑنے میں پہل کرتے ہیں تو یہ الزام سر آتا ہے کہ حرام مہینوں کی حرمت توڑ دی۔ حضورؐ کی طرف سے پہلے ہی سے حرم کی حرمت کا احترام کرنے اور فقط عمرہ کے لیے غیر جنگی سفر کرنے کا خوب اچھی طرح چرچا ہو چکا تھا۔ پھر جنگی اسلحہ ساتھ نہ تھے اور قربانی کے نشان زدہ جانوروں کا گلہ نوعیتِ سفر کی شہادت دے رہا تھا۔ گویا قریش سخت پیچیدگی میں گھر گئے تھے اور اس نازک وقت میں ان کا قائدِ اعلیٰ ابوسفیان سفر میں تھا۔ یہ حضورؐ ہی کی نگاہ جانتی تھی کہ ساری اکڑفوں کے باوجود اس وقت قریش کے لیے مصالحت کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے ـــ اور یہی اندازوں کی صحت ہی حالات کا رُخ بدلتی ہے اور اسی سے کسی کارپرداز کی بصیرت کا معیار سامنے آتا ہے۔

قریش نے پرانی صنم صدا کے نشے میں جلد جلد حلیف قبائل خصوصاً احابیش کی فوجیں بلدح کے مقام پر جمع کر لیں۔

فوراً ہی سفارتی سرگرمیوں کا آغاز ہو گیا۔ سب سے پہلے قبیلۂ خزاعہ کے سردار بدیل بن ورقاء (جو اسلام کے لیے حامیانہ جذبات رکھتے تھے) چند اہم ساتھیوں سمیت حضورؐ سے آکر ملے۔ حضورؐ نے بتایا کہ ہم صرف زیارتِ حرم کے لیے آئے ہیں اور اس کی تعظیم ہمارے مدِنظر ہے، جنگ مقصود نہیں۔ قریش جنگ کے بڑے شائق ہیں حالانکہ اس میں سراسر ان کا گھاٹا ہے۔ کیوں نہ ایسا ہو کہ قریش چند سال کے لیے مصالحت کر لیں۔ اس طرح آپؐ نے اصل مدعا کا بیج شروع ہی میں ڈال دیا۔ انہوں نے قریش سے جا کر بات چیت کی کہ دیکھو، جلد بازی نہ کرو، محمدؐ جنگ کے لیے نہیں، زیارت کے لیے آئے ہیں، مگر سر پھرے نوجوان تو پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ معتمر لوگوں نے ساری بات سنی۔ پھر مکّہ سے حُلَیس بن علقمہ سردارِ احابیش کو بھیجا گیا۔ اس نے جب قربانی کے جانوروں کا گلّہ وادی میں متحرک دیکھا تو متاثر ہوا۔ اس نے قریش کے سامنے جا کر صاف صاف کہا

کہ اِن زائرینِ حرم کو روکنا صحیح نہیں اور ہم اس غرض کے لیے نہیں آئے ! اس سردار کی استمالت یہ کہلا کر کی گئی کہ خدا ہمیں اپنی شرطیں تو منوا لینے دو۔ پھر قریش نے عُروہ بن مسعود ثقفی کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ عروہ نے کہا کہ "اے محمدؐ ! اگر آپ نے اپنی ہی قوم کو تباہ کر دیا تو یہ کونسا اچھا کارنامہ ہوگا۔ یہ جو اوباش سے لوگ آپؐ نے اکٹھے کر لیے ہیں یہ چند روز میں چھنٹ چھنٹا جائیں تو آپؐ تنہا رہ جائیں گے۔" یہ بات سُن کر حضرت صدیقؓ غضبناک ہو گئے اور ذرا سخت لفظوں میں عروہ کو ڈانٹا۔ عروہ عربوں کے بے تکلفانہ طریق پر بات کرتے ہوئے اپنا ہاتھ حضورؐ کی ڈاڑھی کی طرف بڑھاتا تو ہر بار حضرت مغیرہ بن شعبہ تلوار کی نوک سے اس کا ہاتھ ہٹا دیتے۔ حضورؐ نے عروہ کے سامنے بھی اپنا موقف رکھ دیا۔ اس شخص نے جو سماں دیکھا اس سے دل میں بے حد متاثر ہو کر واپس ہوا اور جا کے بیان کیا کہ محبت و اطاعت کا جو منظر وہاں میری نگاہوں سے گزرا ہے وہ تو بڑے سے بڑے بادشاہوں کے درباروں میں بھی نہیں پایا جاتا۔ محمدؐ کے ساتھی تو اس پر دل و جان چھڑکتے ہیں۔ اور ایک ایک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار ہیں۔ اس کے سامنے کوئی شخص اونچی آواز میں بولنے تک کی جرأت نہیں کرتا۔ عُروہ کے اس تاثر سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اسلامی تحریک کی قوت کا ایک راز یہ ہے کہ جماعت اپنی قیادت سے کس درجہ گہری محبت رکھتی ہے اور کس والہانہ طریق سے اطاعت کرتی ہے۔ محبت و اطاعت کے جمع ہو جانے سے ناقابلِ فتح قوت پیدا ہوتی ہے اور جماعت میں ایسی فضا موجود ہو تو مخالفین کو مرعوب اور کمزور کر دیتی ہے۔ یہاں محض کسی جمہوری ایسوسی ایشن کا سا معاملہ نہیں ہوتا کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگے ہیں، نہ صدر کو ارکان سے کوئی قلبی تعلق، نہ ارکان کو صدر سے کوئی روحانی علاقہ۔ بس دستور اور قاعدے کی ظاہری اطاعت کر دی گئی۔ کیا گندی فضا ہوتی ہے ان جماعتوں کی جو اپنی قیادت پر زہریلی تنقیدیں کرتی ہیں، غیبت اور نجویٰ کے محاذ کھولے رہتی ہیں اور طرح طرح کی سازشیں گانٹھتی رہتی ہیں۔ اسلامی نظامِ جماعت کی فضا خیر خواہی، وفاداری، اخلاص، محبت اور والہانہ طاعت سے بنتی ہے۔ اس میں ہر رکن کی شخصیت کی اہمیت ہوتی ہے اور قائد کی شخصیت تو سب کے لیے مرکزِ محبت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نہ رحماء بینہم کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور نہ علیحدہ علیحدہ خون نیاں مرصوص بن سکتے ہیں۔ مسلم جماعت کی یہی فضا اپنی شانِ کمال کے ساتھ حدیبیہ کے میدان میں جلوہ گر تھی جس نے عروہ کے دل کو مرعوب

کر دیا اور اس نے جا کر اسی تاثر کا پرتو مکہ کے خواص پر ڈالا۔

گفت و شنید کے اسی سلسلہ کو آگے بڑھانے کے لیے حضوؐر نے خراش بن امیہ کو قریش کی طرف بھیجا۔ مکہ میں لامرکزیت اور انتشار تو تھا ہی، کچھ لوگوں نے حضوؐر کے اس اونٹ کو مار ڈالا جس پر سوار ہو کر خراش شہر میں گئے تھے، خود ان کی جان بھی مشکل سے بچی اور وہ لوٹ آئے۔ پھر حضرت عثمان کو بھیجا گیا۔ ادھر سر پھرے عناصر کا ایک دستہ دیکھ بھال کے لیے نکلا تھا، ان لوگوں نے مسلمانوں سے چھیڑ خانی کی اور تیر اور پتھر پھینکے۔ ان لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا مگر حضوؐر نے مصلحت کے پیشِ نظر ان کو رہا کر دیا۔ یعنی قریش کا جنگ پسند عنصر برابر اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح سے جنگی جذبات کی بارود بھڑک اٹھے۔ مگر خدا نے یہ لطفِ خاص کف ایدیھم عنکم وکفّ ایدیکم عنھم کی فضا کو غالب کر دیا۔ حضرت عثمانؓ کو قریش نے روک لیا اور واپسی میں دیر ہو گئی۔ ناخوشگوار واقعات کی وجہ سے فضا ایسی تھی کہ جس میں یہ افواہ پھیل گئی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے۔ حضوؐر نے فوراً جماعت کو اکٹھا کیا اور لڑنے مرنے کی بیعت لی۔ فرمایا کہ "ہم ان لوگوں سے لڑے بغیر نہ پلٹیں گے" حضرت عثمانؓ کی جان اس لمحے بے حد قیمتی ہو گئی تھی کیونکہ بارشادِ حضوؐر امرِ واقعہ یہ تھا کہ "عثمانؓ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تفویض کردہ خدمت پر گئے ہیں" اپنے ایک ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا اور اس پر دوسرا ہاتھ اپنی طرف سے رکھ کر کہا کہ اقرار باندھو! آپؐ کے رفقا پہلے ہی جذبات سے بھرپور تھے، اخلاص سے لپک لپک کر بیعت کرنے لگے۔ یہ اتفاقی لمحہ از دیادِ ایمان اور تعمیرِ کردار کا لمحہ تھا اور اس وقت جماعت نے اپنے آپ کو ایثار اتقا دے لیا کہ حضوؐر نے فرمایا: "آج کے دن تم لوگ تمام زمین والوں سے افضل ہو" اس لمحے کے طفیل ان کو رضائے الٰہی حاصل ہوئی۔ صرف ایک منافق (جد بن قیس) تھا جو اس لمحہ کی سعادتوں سے محروم رہا۔ حق کے علمبرداروں کی راہ میں ایسے بے شمار لمحات آتے ہیں اور اخلاص شعار روحیں ان لمحات سے آبیاری حاصل کرتی ہیں۔ خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر چودہ سو مسلمانوں کو لڑ مرنے کی جزا مل گئی۔ قریش کو جب اس صورتِ حالات کا علم ہوا تو انہوں نے فوراً حضرت عثمانؓ کو واپس روانہ کر دیا، کیونکہ فی الحقیقت لڑنے سے وہ بھی کترانا چاہتے تھے۔

پھر مکہ سے مکرز بن حفص آیا۔ رسول اللہؐ کی مردم شناسی ملاحظہ ہو کہ دُور ہی سے نظر پڑی تو

پکار اٹھے "یہ ایک مکار آدمی ہے"۔ مراد یہ تھی کہ اس کے ذریعے معاملات کبھی بخیر و خوبی طے نہیں ہو سکتے بالآخر قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا۔ نظامِ حق کے داعی کی نگاہ حقیقت رس نے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا کہ "قریش نے اِس آدمی کو بھیجا ہے تو پھر وہ صلح پر تیار ہو گئے ہیں"۔ شرائط پر ضروری بات چیت ہوئی اور معاہدہ لکھنے کے لیے حضرت علیؓ کاتب بنے۔

معاہدہ ایسے نازک حالات میں لکھا جا رہا تھا کہ بات بات پر کھچاؤ پیدا ہونے لگا۔ حضورؐ نے پیرایۂ آغاز کے طور پر "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" لکھنے کا حکم دیا۔ سہیل نے کہا کہ ہم نہیں جانتے کہ الرحمٰن الرحیم کیا ہوتا ہے۔ ہمارے معمول کے مطابق "باسمک اللھم" لکھا جائے۔ حضورؐ نے یہ مطالبہ بھی قبول کر لیا۔ پھر فرمایا: لکھو "ذیل کا معاہدہ محمدؐ رسول اللہ اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا"۔ سہیل نے کہا کہ اگر میں یہ مانتا کہ آپ خدا کے رسول ہیں تو آپؐ کے خلاف لڑتا ہی کیوں؟ بس اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوائیے۔ حضرت علیؓ "محمدؐ رسول اللہ" کے الفاظ لکھ چکے تھے اور فرطِ ادب میں اپنے ہاتھ سے "رسول اللہ" کے الفاظ مٹانا ان کو گوارا نہ ہوا۔ حضورؐ نے تحریر لے کر خود یہ لفظ کاٹ دیئے۔ اور ان کی جگہ "محمدؐ بن عبداللہؓ" لکھا گیا

سہیل کی ان زیادتیوں کو نبی پاکؐ کے رفقاء دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھا رہے تھے مگر احترامِ رسالت کی وجہ سے دم بخود تھے۔ اب ذیل کی شرائط لکھی جانے لگیں۔

—— فریقین دس سال کے لیے جنگ بندی اور صلح رکھیں گے۔

—— مسلمان اس سال واپس چلے جائیں اور اگلے سال زیارت کعبہ کے لیے آئیں اور صرف نیام کردہ تلواروں کے ساتھ تین روز حرم میں گزاریں۔

—— قبائلِ عرب کو آزادی ہو گی کہ وہ فریقینِ معاہدہ میں سے جس کے ساتھ چاہیں، حلیفانہ تعلق قائم کریں

—— قریش کے تجارتی قافلے حدودِ مدینہ سے گزریں تو ان کو امان حاصل ہو گی۔

—— قریش کا کوئی آدمی اگر بلا اجازت مدینہ چلا جائے تو وہ واپس کر دیا جائے گا اور اگر کوئی مسلمان مکہ میں آ جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

اس آخری شرط نے جذبات میں سخت ہلچل پیدا کر دی۔ پورا ذہنی ماحول سامنے لایئے تو اندازہ ہو سکتا

ہے کہ جماعت میں ایسے جذبات کا پیدا ہو جانا فطری تھا۔ اوّل تو سرے سے یہی صورتِ واقعہ کچھ کم نادر نہ تھی کہ وہ قریش جنہوں نے لوگوں کو گھروں سے نکالا، جنہوں نے اسلام کے علمبرداروں پر جنگ مسلط کر دی، جو آج بھی ان کو حرم سے روک رہے تھے اور قربانیوں کو لوٹا رہے تھے۔ ایسے ظالم اور برسرِ جنگ مشرکین کے ساتھ یکایک مصالحت کی راہ نکالنا جماعت کے لیے بڑا کاوش طلب واقعہ تھا۔ ان کے سامنے تو ایک ہی کلیہ تھا! بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابداً حتی تومنوا باللہ وحدہٗ۔ تو وہ تو ایک ہی موٹے اصول کو جانتے تھے کہ وقاتلوھم حتیٰ لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہٗ للہ! ان کے سامنے سیدھا سادا فارمولا یہی تھا کہ کلمۃ اللہ کو برتر رہنا چاہیے اور کافروں کے کلمہ کا سر نیچا ہونا چاہیے۔ کفر و باطل کے درمیان سمجھوتہ کی گنجائش ان کے ذہنوں میں نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اصولوں کو اگر محض نظریاتی اور فلسفیانہ طور پر لیا جائے تو بات دوسری ہوتی ہے، لیکن جب ان کو واقعات کے عملی میدان میں لے کے معرکہ آرا ہونا جائے تو پھر وقت اور مصالح اور حریف اور حامی قوتوں کے حالات کو سامنے رکھ کر مختلف اقدامات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ ممکن نہیں ہوتا کہ آپ بس آنکھیں بند کر کے سیدھے ہی سیدھے ایک ہی رفتار سے بڑھتے جائیں۔ کہیں رکنا پڑتا ہے، کہیں دو قدم گھماؤ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کہیں نیا راستہ نکالنے کے لیے دو قدم پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ مختلف دشمنوں کو شکست دینے ہی کے مقصد سے بسا اوقات ان میں سے کسی ایک سے عارضی مصالحت ناگزیر ہو جاتی ہے۔ تاریخ کے یہ وسیع عملی حقائق حضورؐ کی نگاہوں کے سامنے تو تھے ہی، لیکن جماعت کی نگاہ آپؐ کی نگاہ جتنی رسائی نہ رکھتی تھی۔ پھر جب اس جماعت کے سامنے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اور "رسول اللہ" کے الفاظ قلمزد کیے گئے تو جذبات میں خاصا مدوجزر پیدا ہو گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر جب وہ غیر مساویانہ اور غیر عادلانہ شرط سامنے آئی تو صبر و ضبط بحال رکھنا مشکل ہو گیا۔ حضورؐ اس معاہدے کے لیے جن بڑے بڑے مسائل کو حل کرنے کی راہ نکال رہے تھے ان پر جہاں قریش کی نظر نہ تھی، وہاں مسلم جماعت بھی پوری طرح ان کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کبھی کبھار بڑی بڑی تحریکوں کے دورانِ کار میں ایسے نازک لمحات بھی آ جاتے ہیں جبکہ قائد اور جماعت کے درمیان مستقبل کے معاملات کی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے ذہنی فاصلہ بڑھ جاتا ہے۔ قیادت کی نگاہ زیادہ فاصلے تک دیکھتی ہے اور جماعت نسبتہً نزدیکی حقیقتوں تک سوچتی ہے۔ یہی مواقع بحران کے

مواقع بن جاتے ہیں۔ اور انہی شاذ مواقع پر ضابطے کی حد سے بڑھی ہوئی جمہوریت خطرناک ہو جاتی ہے۔ ایسے مواقع پر صرف وہی قیادت اپنا فرض ادا کر سکتی ہے جو رائے عام کا اعتماد و تعاون اس حد تک رکھتی ہو کہ اس کا کوئی بدل نہ پیدا کیا جا سکے۔ ایسی مخلص اور مستحکم قیادت جماعت کو اہم مصالح کی راہ پر مجرد اپنی اخلاقی قوت سے کھینچ کر لے جاتی ہے اور عقلی اطمینان جماعت کو بعد کے حالات و واقعات کو دیکھ لینے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔

غضب یہ ہوا کہ عین اسی حالت میں نمائندۂ قریش سہیل کے صاحبزادے ابو جندل بیڑیاں پہنے ہوئے موقع پر آ پہنچے۔ ان کو مارا پیٹا گیا تھا اور وہ مظلومی کا ایک مجسمہ تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو سربزم عالم اور مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا۔ سہیل بن عمرو نے کہا کہ مجوزہ شرط کے مطابق یہی پہلا شخص ہے جسے آپؐ کو واپس کرنا ہو گا۔ حضورؐ نے معاملہ سلجھانے کے لیے فرمایا کہ ابھی معاہدہ لکھا نہیں جا چکا، سو ابو جندلؓ کو مستثنیٰ رہنے دو۔ سہیل نے کہا تو پھر کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی۔ پھر آپؐ نے نرمی سے یہ بھی فرمایا کہ اچھا اسے میری خاطر میرے ساتھ آنے دو۔ وہ نہیں مانا۔ مجبوراً حضورؐ نے اس ظالمانہ مطالبہ کو بڑے مصالح کی خاطر قبول کر لیا۔ اب ابو جندلؓ نے جماعت کو مخاطب کر کے فریاد کی کہ مسلمانو! تم مجھے مشرکوں کے حوالے کر رہے ہو جو مجھے ایمان سے ہٹانے کے لیے مجھ پر تشدد کریں گے۔ یہ اپیل اپنے ماحول میں بڑی اشتعال انگیز تھی۔ مگر حضورؐ اس وقت ٹھنڈے مزاج کا ایک بے مثل نمونہ تھے۔ ابو جندل کو نرمی سے سمجھایا کہ ہم نے معاہدہ میں ایک بات تسلیم کر لی ہے تو اب ہم عہد شکنی نہیں کر سکتے، تمہارے لیے اور دوسرے مظلوموں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راہِ نجات نکالے گا، ذرا صبر سے کام لو۔

جماعت کا اضطراب اس وقت آخری حد کو چھو رہا تھا اور قریش کے خلاف ساری جماعت کے جذبات مجتمع ہو کر جس شخص کے اندر کھول رہے تھے وہ حضرت عمرؓ تھے۔ ان کا کوئی ذاتی اور نفسانی معاملہ نہیں تھا، ان کے اندر حمیتِ حق ہی کام کر رہی تھی۔ پیچ و تاب کے عالم میں انہوں نے پہلے حضرت ابوبکرؓ سے اور پھر رسول اکرمؐ سے یوں مکالمت کی:

حضرت عمرؓ: اے اللہ کے رسولؐ! کیا آپؐ اللہ کے رسول نہیں ہیں؟

رسولِ خدا: کیوں نہیں!

حضرت عمرؓ: "پھر کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟"

رسولِ خدا: "کیوں نہیں!"

حضرت عمرؓ: اور کیا وہ لوگ مشرک نہیں ہیں؟"

رسولِ خداؐ: "کیوں نہیں!"

حضرت عمرؓ: پھر ہم دین کے معاملے میں دب کر کیوں معاملہ کریں؟"

رسولِ خدا: "میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، میں اس کے کسی حکم کو توڑ نہیں رہا اور نہ وہ مجھے اپنی مدد سے محروم رکھے گا۔"

حضرت عمرؓ چپ تو ہو گئے، لیکن جذبات میں دیر تک ٹھہراؤ نہیں آسکا۔ معاہدہ لکھا گیا اور اس پر حضرت عمرؓ نے بطورِ گواہ دستخط ثبت کرکے اطاعت کی یہ زرّیں مثال بھی پیش کر دی کہ شرائط پر دل مطمئن نہیں مگر حضورؐ نے فیصلہ کر دیا تو پھر سرکشی بھی نہیں۔

معاہدہ ہو چکا تو حضورؐ نے جماعت کو نحر (اونٹ ذبح کرنے) اور حلق (سر مونڈانے) کا حکم دیا۔ مگر اضطراب اور غم و اندوہ کی وجہ سے جماعت میں کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی۔ دوبارہ حکم دیا تو بھی کوئی نتیجہ نہیں۔ سہ بارہ فرمایا تو بھی وہی حالت طاری رہی۔ اندازہ کیجیے کہ خود حضورؐ کی تربیت یافتہ جماعت میں اس وقت کیسا ذہنی بحران طاری تھا ــــــ اور سبق لیجیے کہ انسانی سرگرمیوں میں کیسے گوناگوں عالم پیش آتے ہیں۔ حضورؐ کو یہ رنگ دیکھ کر صدمہ ہوا، قیام گاہ پر آئے اور حضرت ام سلمہؓ سے شکایت کی کہ لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میں نے حکم دیا اور تعمیل نہیں ہوئی۔ حضرت ام سلمہؓ نے تسلی دلائی کہ معاہدہ کی شرائط سے وہ اندوہگیں ہیں، آپؐ باہر نکل کر خود نحر و حلق کیجیے۔ سرورِ عالم اُٹھے اور باہر آکر قربانی کی، اور بال اتروائے۔ اس عملی اقدام نے جماعت کو جادۂ طاعت پر بحال کر دیا۔ لیکن پھر بھی عالم یہ تھا کہ جیسے لوگ ایک دوسرے ہی کو کچا چبا جائیں گے۔ تاہم یہ رَو وقتی رَو تھی اور گزر گئی۔

اندازہ کیجیے کہ جنگ سے ہٹ کر مصالحت کی فضا حاصل کرنے کے لیے حضورؐ نے کتنی کٹھن صورتِ حالات سے گزرنا گوارا کیا۔ بلکہ اپنی محبوب جماعت کے نہایت ہی گہرے اور پاکیزہ اور مخلصانہ جذبات

تک کی قربانی اس مقصد کے لیے دی۔

آپؐ نے اس معاہدہ کے ذریعے عظیم مقاصد حاصل فرمائے۔ ایک یہ کہ مسلم جماعت اور مشرکین مکہ وعرب کے درمیان ہر طرح کے میل جول کے راستے کھل گئے۔ لوگوں کی آمد و رفت ہوئی، برسوں کے بچھڑے ہوئے عزیز و اقارب اکٹھے ہو کر بیٹھے، مکہ میں جو غلط فہمیاں حضورؐ اور مسلم جماعت کے بارے میں ہوگئی وہ مشرکین کی طرف سے سامنے آنے لگیں اور مسلمان ان کو صاف کرتے، لوگوں کے سوالات کے جوابات دیتے، انہیں اپنی روحانی، ذہنی، علمی اور اخلاقی اور مادی ترقیوں کا حال بتاتے، دعوتِ حق اور نظریۂ اسلامی گھر گھر میں زیرِ بحث آنے لگا۔ اور امن کے حالات میں اسلام اس تیزی سے پھیلا کہ صلح حدیبیہ کے بعد کے دو برس میں اتنی تعداد خوشی خوشی حق کے محاذ پر آکھڑی ہوئی جتنی اس سے قبل کے اٹھارہ انیس برسوں میں مجموعی طور پر حاصل ہوئی تھی جتنی کہ خالدؓ اور عمرو بن العاصؓ جیسے کام کے نوجوان بھی اسی مصالحت کے بعد حلقہ اسلامی میں آ داخل ہوئے۔

دوسرا مقصود یہ حاصل ہوا کہ جنگ و جدال سے نجات پا کر جماعت کی ذہنی و اخلاقی اصلاح اور خود ریاست کے نظم و نسق کی تعمیر کا کام انجام دینے کے لیے یکسوئی حاصل ہوگئی۔ علاوہ ازیں غیر ملکی حکومتوں کو دعوت دینے کا موقع نکل آیا۔

تیسرا فائدہ یہ پہنچا کہ حکومتِ مدینہ خیبر کے معاندانہ محاذ کا قلع قمع کرنے کے لیے قریش کی طرف سے بالکل بے فکر ہوگئی۔ چنانچہ صلح حدیبیہ کے بعد فوراً ہی اسلامی حکومت اس قضیے سے فارغ ہوگئی۔

چوتھا مفاد یہ حاصل ہوا کہ عرب کے قبائل کو آزادی حاصل ہوگئی کہ ان میں سے جو بھی چاہے، حکومتِ مدینہ کا ساتھ دے۔ یہ ایسا دروازہ کھلا کہ جس میں سے گزر کر نئے نئے عناصر مسلم جماعت کو تعاون بہم پہنچا سکتے تھے اور قریش کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ بنو خزاعہ نے تو عین موقع ہی پر اسلامی حکومت سے تعلق جوڑ لیا۔

اور چوتھا نتیجہ یہ بھی نکلنا ہی تھا کہ ایک ہی سال بعد بڑے ٹھاٹھ سے یہی جماعت زیارتِ حرم کے لیے مکہ میں داخل ہوئی اور اس وقت قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق "لا تخافون" کی فضا میسر تھی۔

سو کہنا چاہیے کہ قریش جیسے کڑے دشمنوں کو مصالحت پر لے آنا حضور اکرمؐ کی سیاست کاری کا ایک

نمایاں معجزہ تھا اور ایک شرط میں بظاہر ذرا سا دب کر حضورؐ نے وہ فوائد اور نتائج حاصل کر لیے جن کا تصور بھی قریش اس وقت نہ کر سکے ہونگے۔ انہیں کب یہ خیال آسکا ہو گا کہ اب ایک طرف ان کے حامی یہودیوں کا جنگی اڈا اکھڑ جانے والا ہے اور وہ اکیلے رہ جائیں گے اور دوسری طرف اسلام لوگوں کو اتنی بڑی تعداد میں کھینچ لے جائے گا بلکہ خود ان کے شہر میں اتنے اثرات پھیلا دے گا کہ ان کی طاقت موجودہ معیار سے بھی گر جائے گی۔ درحقیقت اس معاہدہ نے وہ راستہ بنا دیا جس پر چل کر اسلامی انقلاب کی طاقت چند برس کے اندر اندر اسی مکہ میں فاتحانہ شان سے داخل ہونے والی تھی۔

واپسی پہ راستے ہی میں سورۂ فتح کی آیات نازل ہوئیں۔ جس میں پچھلے واقعات پر تبصرہ تھا اور مستقبل کے مصالح کی جھلک دکھا کر مسلم جماعت کو اللہ تعالیٰ نے بشارتیں دیں۔ ان کو بتایا کہ تم عنقریب ایک ایسے معرکے (یعنی خیبر) میں فتح حاصل کرو گے جس میں تم کو بہت سا مالِ غنیمت ملے گا اور اس کے بعد وہ کچھ حاصل ہو گا جو اس وقت تمہاری طاقت سے باہر ہے اور جس کو اللہ ہی نے گرفت میں لے کر محفوظ کر رکھا ہے۔ پھر بتایا کہ اگرچہ مشرکینِ مکہ کو تم آج بھی شکست دے سکتے تھے اور وہ یقیناً پیٹھ دکھا کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ لیکن ان کے درمیان ایسے مرد و زن گھرے ہوئے ہیں جو مخفی طور پر دینِ حق کو مان چکے ہیں اور جن کے دل تمہارے ساتھ ہیں۔ اب اگر جنگ ہو جاتی تو وہ مجبوراً تمہارے مقابلے پر آتے اور تم انہیں نہ جاننے کی وجہ سے نشانہ بناتے۔ پس اللہ تعالیٰ کی یہ خاص مہربانی ہوئی کہ اس نے دونوں گروہوں کو ٹکراؤ سے روکا۔ خصوصاً وہ لمحہ یاد دلایا جبکہ کفر کی جانب سے حمیتِ جاہلیہ کا بڑا اکڑا مظاہرہ کیا گیا تھا اور "الرحمٰن الرحیم" اور "رسول اللہ" کے الفاظ تک کی کتابت گوارا نہ کی گئی۔ نیز ابوجندل کے معاملہ میں انتہائی ضد سے کام لیا گیا۔ ایک فریق جب اس طرح کا بیٹرھا رویہ اختیار کر لیتا ہے تو پھر دوسری طرف بھی نرم اور ٹھنڈے جذبات بر سرِ کار نہیں آسکتے۔ لیکن یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم تھا کہ رسولؐ اور تم مسلمانوں کے اوپر اس نے سکینت اتاری، تمہیں جذبوں پر قابو دیا اور تمہیں تقویٰ اور احتیاط کے اصول پر کاربند رکھا ــــــ اور تم لوگ مشرکین کے مقابلے میں اسی شان کے مستحق اور اسی کے اہل تھے ورنہ اگر ادھر سے بھی اشتعال سے کام لیا جاتا تو تصادم ہو جاتا اور وہ سارے مصالح ختم ہو جاتے جو نہایت آسانی سے حاصل ہو رہے تھے۔

سورۂ فتح کا آغاز اس کلمے سے ہوتا ہے کہ "انا فتحنا لك فتحاً مبيناً" حضرت عمرؓ نے حیرت سے پوچھا کہ کیا واقعی یہ فتح مبین ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ہاں یہ فتح مبین ہے۔ گویا واقعات کی روشنی میں عقلی اطمینان خاصی دیر بعد پیدا ہوا۔ اس موقع پر حضرت عمرؓ نے حمیتِ حق کے مخلصانہ جذبے میں جو جذباتی مظاہرہ کیا تھا اس کی تلافی کے لیے وہ مدتوں نفلی عبادات انجام دے دے کر خدا سے عفو طلبی کرتے رہے۔ اخلاص کی شان یہی ہے دوسری طرف حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شان یہ تھی کہ اس عمومی لمحۂ اضطراب میں ان کو پورا پورا اطمینان رہا اور انسانی جماعتوں کو مزاجوں کی یہی رنگارنگی ایک خاص ترکیب دیتی ہے۔ ان کا ایک سرا اگر صدیقی رجحان سے بنتا ہے تو دوسرا سرا فاروقی انداز سے!

اب سنیے کہ کیسے معاہدہ کی وہی دفعہ قریش کے لیے وبالِ جان بن گئی جسے تسلیم کرا کے وہ اپنا پلڑا جھکتا محسوس کر رہے تھے۔ اول تو اس کی وجہ سے مکہ میں خفیہ طور پر اسلام قبول کرنے والوں کا حلقہ اندر ہی اندر بڑھتا رہا اور ان کی وجہ سے قریش کی اجتماعیت کھوکھلی ہوتی گئی۔ دوسری طرف ایک بہت ہی سنگین واقعہ پیش آیا۔ ابوبصیر عتبہ بن اسید کسی نہ کسی طرح مکہ سے نکلے اور مدینہ جا پہنچے۔ ان کو لینے کے لیے قریش نے دو آدمیوں کا وفد بھیجا۔ حضورؐ پابندیٔ عہد کے اٹل اصولوں سے مجبور تھے، سو ابوبصیر کو لوٹا دیا گیا۔ آپؐ نے ابوبصیر کو بھی وہی تاکید کی کہ تم لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ کوئی راستہ نکالے گا۔ چار و ناچار ابوبصیر لوٹ گئے۔ راستے میں موقع پا کر انہوں نے دو میں سے ایک نگران کو اسی کی تلوار سے قتل کر دیا اور خود بھاگ کر پھر مدینہ آ گئے۔ دوسرا نگران پھر شکایت لے کے آ موجود ہوا۔ ابوبصیر نے حضورؐ کے سامنے وضاحت کر دی کہ آپؐ نے اپنا عہد نبھایا اور مجھے دشمنوں کے سپرد کر دیا، لیکن میں اپنے آپ کو مشرکوں کے سپرد کر کے ایمان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ سو میں نے اپنی ذمہ داری پر یہ اقدام کیا ہے، آپؐ پر کوئی ذمہ داری ہے ہی نہیں۔ خدا نے مجھے بچا لیا۔ حضورؐ نے بڑے پر معنی طریق سے فرمایا: "اسے کچھ آدمی مل جائیں تو یہ تو جنگ بھڑکا دیگا"۔ ابوبصیر کو اندیشہ ہوا کہ شاید مجھے پھر مکہ روانہ کر دیا جائے اس لیے وہ چپکے سے مدینہ سے نکل کر ساحلِ سمندر کی طرف مقامِ عیص (قریب بہ ذوالمرہ)، جا پہنچے اور وہاں ڈیرہ ڈال دیا۔ بعد میں ابوجندل بھی وہیں آ گئے۔ پھر مکہ سے اور لوگ بھی نکلتے اور سیدھے ساحل کا رخ کرتے۔ ہوتے ہوتے ستر جوانوں کا دستہ یہاں جمع ہو گیا۔ مکہ والوں سے

ان کی اصولی کشمکش بھی تھی اور ذاتی مظلومی کا جذبۂ انتقام بھی تھا اور یہ حکومتِ مدینہ کے شہری بھی نہ تھے کہ ان پر معاہدہ کی ذمہ داری ہوتی۔ یہ گویا ایک "آزاد اسلامی محاذ" تھا۔ ان لوگوں نے قریش کے قافلوں کی مزاحمت شروع کی یہاں تک کہ قریش عاجز آگئے۔ سو انہوں نے خود ہی درخواست کر کے معاہدہ سے اپنی محبوب شرط نکلوائی۔ بعدازیں ان نوجوانوں کو حضورؐ نے مدینہ بلالیا اور نومسلموں کے لیے مکہ سے ہجرت کرنے کا راستہ بالکل کھل گیا۔

ایک اہم مسئلہ اس وقت پیدا ہُوا جب ام کلثوم جو مکی سردار عقبہ ابن ابی معیط کی صاحبزادی تھیں، ہجرت کر کے مدینہ آپہنچیں۔ ان کو واپس لے جانے کے لیے ان کے دو بھائی عمارہ اور ولید ساتھ ہی ساتھ آگئے معاملہ حضورؐ کے سامنے آیا تو بحکم الٰہی آپؐ نے ام کلثوم کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ ظاہر بات ہے کہ ایک اصولی مسلک کی خواتین کو دشمن یا مخالف کے سپرد کرنے کا معاملہ مردوں سے بالکل مختلف نوعیت رکھتا ہے۔ اس انکار میں ایک ایسا اخلاقی وزن موجود تھا اور معاہدہ کے الفاظ بھی ایسے عمومی سے تھے کہ عورتوں کے مسئلہ میں تعبیری اختلاف کی گنجائش نکلتی تھی، اس لیے جب دونوں بھائی واپس پہنچے تو قریش نے اس صورت کو قبول کر لیا حضورؐ نے سورۂ ممتحنہ کے احکام کے تحت اسی انکار کے ساتھ چونکہ چند اور فیصلے کیے تھے کہ ایک تو مسلمان اپنی ان سابق کافرہ بیویوں کو طلاق دے دیں جو مکہ میں تھیں اور دونوں طرف سے مہر ادا کیے جائیں، اس لیے بہ حیثیت مجموعی یہ معاملہ قریش کو بھی اچھا معلوم ہُوا۔

یہ تھا وہ تاریخی معاہدہ جو اپنے نتائج کے اعتبار سے بجائے خود فتح عظیم کی حیثیت رکھتا تھا اور جس تک قریش کو لانے اور اس سلسلے کے جملہ پر پیچ مراحل کو طے کرنے میں حضورؐ نے ایسی سیاسی حکمت اور قائدانہ بصیرت کا مظاہرہ کیا جس سے بعد والوں کو تا قیامت رہنمائی ملتی رہے گی۔ یہ مصالحت حضورؐ کی سیاست کاری کا ایک بے مثل شاہکار ہے۔

عمرۃ القضا معاہدہ میں طے تھا کہ اس سال مسلمان واپس چلے جائیں اور اگلے سال آکر زیارت کریں چنانچہ دوسرے سال ۷ھ میں حضورؐ نے رفقاء سمیت مکہ کا رُخ کیا۔ یہ سفر بھی اگر مرتبۂ اول میں دینی تھا تو مرتبۂ دوم میں سیاسی۔ اس سے گہرے اثرات فضا میں مترتب ہوئے اور اس کی وجہ سے اسلام کا نفوذ نہ صرف مکہ میں بڑھ گیا بلکہ سارے عرب میں بھی مسلمانوں کا حرم میں آزادانہ داخلہ نہایت اچھے ذہنی اثرات

کا موجب ہوا۔

دو ہزار افراد، سو گھوڑوں اور قربانی کے ساٹھ (یا اسّی) اونٹوں کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسلحہ کا ذخیرہ بند حالت میں ساتھ لیا گیا مگر آگے جا کر مقام یاجج میں رکھ دیا گیا۔ بروئے معاہدہ قریش کو تین دن کے لیے مسلمانوں کے لیے حرم بالکل کھول دینا پڑا۔ بعض کٹر مخالفین تو شہر چھوڑ کے دور جبل قُعیقعان وغیرہ کی طرف چلے گئے تاکہ اس منظر کو دیکھنے نہ پائیں۔ لیکن عام باشندے، عورتیں اور بچے دارالندوہ کے پاس صف باندھے کھڑے تھے اور اس انقلابی طاقت کا نظارہ کر رہے تھے جس نے مکہ ہی کی فضاؤں میں ابتدائی نشوونما پائی تھی۔

داخلہ اس شان سے ہوا کہ عبداللہ بن رواحہ حضورؐ کی سواری کی باگ تھامے ہوئے آگے آگے ایک رجزیہ گیت الاپ رہے تھے۔ چند بول یہ تھے:

باسمِ الذی لا دین الا دینہٗ	اس ہستی کا نام لیکر ہم داخل ہوتے ہیں جس کے دین کے علاوہ کوئی دین نہیں
باسم الذی محمد رسولہ	اس ہستی کا نام لیکر ہم داخل ہوتے ہیں، محمد جس کے رسول ہیں۔
خلّوا بنی الکفار عن سبیلہ	اے کفار کی اولاد، اس کے راستے سے ہٹ جاؤ۔
قد نزّل الرحمٰن فی تنزیلہ	الرحمٰن نے اپنی نازل کردہ کتاب میں یہ تعلیم دی ہے:
بان خیر القتل فی سبیلہ	کہ بہترین جنگ وہ ہے جو خود اسی کی راہ میں لڑی جائے۔
یا ربّ انی مومن بقیلہ	اے میرے پروردگار! میں تیرے نبی کے قول پر ایمان رکھتا ہوں۔

گیت ہی گیت میں پوری دعوتِ حق بیان ہو رہی تھی جس کی گونج سے مکہ کی فضائیں برسوں سے خالی ہو چکی تھیں۔ اس میں جہاد تک کا رجز شامل تھا۔ اس میں رحمٰن کے اسی پیارے نام کی پکار ہو رہی تھی جس سے قریش کو چڑ تھی۔ اس میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اعلان ہو رہا تھا۔ اسلام دشمن طاقت کو پُر معنی انداز سے کہا جا رہا تھا کہ اس رسولؐ کے راستے سے ہٹ جاؤ اور مزاحمت چھوڑ دو۔ آج کوئی نہ تھا جو مکہ میں رکاوٹ ڈال سکے۔ معاہدے نے ہاتھوں اور زبانوں کو باندھ رکھا تھا۔

حضورؐ نے داخلہ کے وقت جماعت کو حکم دیا کہ خوب مونڈھے کھول کر اور سینہ تان کر چلو اور پھیل پھیل کر

طواف کرو تاکہ اس پروپیگنڈہ کی تردید ہو جائے کہ مہاجرین کی حالت بھوک اور بخار نے پتلی کر رکھی ہے۔ اس وقت دشمنوں کو مرعوب کرنا ضروری تھا۔ حضورؐ نے کیا خوب فرمایا کہ "خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جو آج کفار کے سامنے قوت کا اظہار کرے"۔ اسی مصلحت سے آپ استلام رکنِ یمانی سے استلام رکنِ اسود تک نرم چال (مشی) چلتے اور اس حصے میں دیکھنے والا مجمع اوجھل ہو جاتا، پھر بعد کے دور میں ہلکی دوڑ (رمل) لگاتے اور یہی حصہ مجمع کے سامنے تھا۔ معلوم ہوا کہ مخالف حلقوں میں علمبردارانِ اسلام کی کمزوری (خواہ وہ جسمانی ہو) کے چرچوں کو روکنا اور ان پر قوت و شوکت کے مظاہرہ سے رعب ڈالنا اسلامی سیاست کی ایک اہم حکمت ہے۔ یہ اتنی اہم حکمت ہے کہ عین حرم میں اور عین دورانِ طواف میں بھی اس کو ملحوظ رکھا گیا۔ یہ مظاہرۂ قوت کبر و غرور کی تعریف میں نہیں آتا بلکہ یہ عین کارِ ثواب ہے۔ ایسے موقع پر اگر فروتنی اور انکسار دکھایا جائے تو وہ بالکل الٹا پڑے۔ ان چھوٹے چھوٹے امور سے شہادت ملتی ہے کہ حضورؐ وقت کے سیاسی تقاضوں پر کتنی گہری نظر رکھتے تھے اور ان کو پورا کرنے کا کتنا اہتمام کرتے تھے۔ آخر یہ سیاست ذاتی جاہ کے لیے نہ تھی، خدائی نظامِ عدل کی سربلندی کے لیے تھی، اس لیے سراسر دین تھی اور اس کا ہر اقدام ایک عبادت تھا۔

غور کیجیے کہ نظامِ حق کے داعیوں کی اس جماعت کو جب مکہ کا مجمع دیکھ رہا ہو گا تو مردوں اور عورتوں اور بچوں پر کیسے کیسے اثرات پڑ رہے ہوں گے۔ خیال آتے ہوں گے کہ یہ اسی دین کی فصل ہے جس نے مکہ سے آغاز کیا تھا۔ اور پھر غارِ حرا، خانۂ ارقم، شعبِ ابی طالب، دارالندوہ اور غارِ ثور کے تاریخی مقامات ان کے سامنے سر اٹھا اٹھا کر کہتے ہوں گے کہ دیکھو نیکی کی یہ طاقت کتنی عظیم ہے اور تم اس کے مقابلے میں کتنے فروتر ہو کے رہ گئے ہو۔ مکہ کی گلیوں کے ذرّے تڑپ اٹھے ہوں گے اور زبانِ حال سے ان لوگوں سے کہہ رہے ہوں گے کہ یہ وہ صبر کیش لوگ ہیں جن کو تم نے بغیر کسی جرم کے کئی سال تک دکھ دیئے تھے، دیکھو کہ آج وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ کتنے ہی کانٹوں نے سر اٹھا کر کہا ہو گا کہ تم نے ہماری نوکوں سے ان جسموں کو اذیت دی تھی۔ پھر کہیں سے حضرت ابوذرؓ کی کلمہ کی وہ پہلی پکار کعبہ سے گونجنے لگی ہو گی جس پر ہنگامہ مچ گیا تھا، کہیں سے حضرت بلالؓ کی احد احد کی صدائیں بلند ہونے لگی ہوں گی جو تپتی ریت کے بستر پہ پڑ کر دل سے اٹھتی تھیں۔ دانغۂ

رہ چکے لگا ہوگا کہ تم لوگوں نے جس کے قتل کی سازشیں کی تھیں اس کا پیغام گوشے گوشے میں تبدیلی لا رہا ہے۔ تیرہ برس کی تاریخ ہر چہار جانب سے امڈ پڑی ہوگی اور پھر بدر اور اُحد میں کام آنے والوں کی یادیں خونیں پیرہن سجائے نمودار ہوئی ہونگی ۔۔۔ اور ان کی روحوں سے صدا اٹھی ہوگی کہ تم بھی جاگو، تم بھی بدلو، تم بھی آگے بڑھو اور اس سیلِ رواں میں شامل ہو جاؤ۔

ایک طرف اس جماعت کے طرزِ عبادت کا مظاہرہ ہوا ہوگا اور دوسری طرف یہ اخلاقی مثال قائم ہوتی ہوگی کہ اتنی بڑی تعداد شہر مکہ میں تین دن تک موجود رہی، لیکن باوجود سخت عناد کے کسی کے جان و مال کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ گھر جس طرح مقفل کر کے مشرکین باہر نکل گئے تھے اسی طرح صحیح سلامت رہے۔

اسلام کے حامی عناصر جو مکہ میں ایمان چھپائے بیٹھے تھے ان کی آنکھیں اس نظارے سے کیسی ٹھنڈی ہوتی ہونگی، ان کے جذبوں کو ایک نئی طاقت ملی ہوگی، ان کے اندر تازہ امیدیں ابھر آئی ہونگی۔ مخالفین اپنے آپ کو کتنا پستا ہوا محسوس کر رہے ہونگے۔ اور ان کی آنکھوں کے سامنے کتنا تاریک مستقبل ہوگا۔

تین دن تک شہر کی فضاؤں میں یہ گھٹا موتی برساتی رہی۔ چوتھے روز سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے جبکہ آپؐ انصار کے درمیان بیٹھے بات چیت کر رہے تھے۔ سہیل نے کہا کہ تین دن پورے ہو چکے، اب میری زمین سے نکل جاؤ۔ سعد بن عبادہ اس طرزِ خطاب پر ضبط نہ کر سکے۔ انہوں نے کہا: "زمین نہ تیری ہے نہ تیرے باپ کی۔ ہم ہرگز نہ نکلیں گے۔" حضورؐ نے فوراً ہی فضا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ذرا لطیف اندازِ گفتگو اختیار فرمایا۔ (حضورؐ نے حضرت میمونہ سے اسی موقع پر نکاح کیا تھا) "دیکھو، ہم نے یہاں سے نکاح کیا ہے، کیا ہرج ہے کہ ذرا کھانا دانا پک جائے، ہم بھی کھائیں اور آپ لوگ بھی شریک ہوں۔" اس فقرے میں کئی پہلو تھے، مگر ان کی کثافتِ مزاج میں فرق نہ آیا۔ کہا گیا کہ ہمیں کھانے وانے کی ضرورت نہیں، بس آپ چلے جائیے۔ وہ بچارے بھی کیا کرتے، دیکھ رہے تھے کہ ساری فضا متاثر ہو رہی ہے۔ ان کے اصرار کی وجہ سے حضورؐ نے جماعت کو کوچ کا حکم دیا۔ چلتے وقت حضرت حمزہ بن عبدالمطلب کی چھوٹی سی بچی "یا عم! یا عم!" پکارتی دوڑی دوڑی آئی اور آپ سے لپٹ گئی۔ کیا ہی رقت انگیز سماں ہوگا۔ حضورؐ نے اس بچی کو ساتھ لے لیا۔ بعد میں یہ بچی اپنی خالہ کے سپرد کی گئی جو زید بن حارثہ

کی اہلیہ تھیں۔

اب یاد کیجیے اس واقعہ کو کہ حدیبیہ سے واپسی میں حضورؐ پر اعتراض ہوا تھا کہ آپؐ نے تو فرمایا تھا کہ ہم حرم میں داخل ہونگے اور طواف کریں گے (سوال کا مدعا یہ تھا کہ ایسا ہوا تو نہیں!) حضورؐ نے جواب دیا: "میں نے یہ کب کہا تھا کہ اسی سال!" — اور اگر واقعی ۶ھ میں وہ بات پوری بھی ہوتی تو اس شان سے نہ ہوتی بلکہ خون خرابے کے ساتھ ہوتی۔ ایک سال کا فاصلہ تحریکوں کی تاریخ میں ایک لمحہ کی سی نوعیت رکھتا ہے۔ ذرا سے وقفے کے بعد بے خوفی کی حالت میں اور پوری آن بان سے حرم میں داخلہ اور عمرہ کا ہونا بے حد برکات رکھتا تھا۔

پھر جب اس واقعہ کا قبائلِ عرب میں چرچا ہوا ہوگا تو رائے عام اس تبدیلیٔ احوال سے بہرحال متاثر ہوئی ہوگی۔ لوگ محسوس کرتے ہونگے کہ جس مکہ سے مسلمانوں کو نکالا گیا تھا اس میں وہ سینہ تانے اور مونڈھے کھولے داخل ہوئے، جو قریش مسلم جماعت کو مٹا دینے کے درپے تھے انہوں نے اسی سے مصالحت کرکے اپنے آپ کو بے بس کر لیا۔ اس سے یہ اندازے لازماً باندھے گئے ہونگے کہ مستقبل مدینہ کا ہے! ظاہر بات ہے کہ دلوں کے دروازے اسلام کے لیے اور زیادہ کھل گئے ہونگے۔

مختصر یہ کہ عمرۃ القضا بھی اسلام کے فروغ میں بہت ممد ہوا۔

رسول کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی

(پچھلے دنوں دمشق کے ماہنامہ "المسلمون" میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی کتاب تفہیمات حصہ اول کے دو مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعت رسول" شائع ہوئے تھے۔ پہلے مضمون کے شائع ہونے کے بعد دمشق کے ایک صاحب کا اس کے متعلق "المسلمون" میں ایک استفسار شائع ہوا جس کا خلاصہ مندرجہ ذیل ہے:

"کیا محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام باعتبار انسان ہمارے اندر ایک عام فرد کی حیثیت رکھتے ہیں؟ اور باعتبار انسان ان کے اندر بھی ایسی ذاتی خواہشات پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر وہ لوگوں پر اپنی ذاتی عظمت کا سکہ جمائیں اور اپنے شخصی اقتدار کے پنجے میں جکڑیں؟ اگر یہ صورت ہے تو آپ کا بحیثیت نبی معصوم ہونا اور بحیثیت انسان محفوظ ہونا چہ معنی دارد؟ آپ کی اس زندگی کی تفصیلات کیا ہیں جب کہ آپ محض انسان تھے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت پر سرفراز نہیں فرمایا تھا؟ اور کیا رسول ہونے کے بعد آپ کی یہ حیثیتیں، حیثیت بشری اور حیثیت نبوی یکجا ہو گئی ہیں یا الگ الگ ہیں؟ اور کیا ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے؟ تاکہ محمد الرسول کی اطاعت کی جائے اور محمد الانسان کی مخالفت میں ہم آزاد ہوں؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی قاعدۂ کلیہ بھی موجود ہے جس کی روشنی میں ہم آپ کے انسانی کلام — جس سے اختلاف کا ہمیں حق ہے — اور نبوی کلام — جو واجب الاطاعت ہے — کے درمیان خطِ امتیاز کھینچ سکیں؟

کیا نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہے؟ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کے اندر یہ روح پھونکتے تھے کہ بحیثیت انسان آپ کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ بلکہ اپنی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرتے تھے؟ نیز کیا یہ درست ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسی حجت اور دلیل کی بنا پر آپ سے بحیثیت انسان اختلاف کیا تھا ...؟"

اس استفسار کا رُخ چونکہ دمشق ہی کے ایک مشہور عالم محمد منتصر الکتانی کی طرف تھا اس لیے مولانا

مودودی نے از خود اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہ کی، لیکن اس کے بعد جب "المسلمون" میں مولانا کا دوسرا مضمون شائع ہوا تو مولانا کو ادارہ المسلمون کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا کہ ان دونوں مضمونوں میں یہاں ایک طرح کا تعارض محسوس کیا جا رہا ہے، جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے اس پر مولانا نے "المسلمون" میں شائع ہونے کے لیے جو مضمون بھیجا ہے، اسے ہم قارئین ترجمان القرآن کی اطلاع واستفادہ کے لیے ذیل میں نقل کر رہے ہیں — م۔ع۔ح]

"المسلمون" جلد ششم، شمارہ ۶، ۷ اور ۸ میں میرے جو مضامین "آزادی کا اسلامی تصور" اور "اتباع و اطاعت رسول" کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں، ان کے متعلق مجھے توجہ دلائی گئی ہے کہ ان میں تناقض محسوس ہوتا ہے، جسے رفع کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی پہلے مضمون میں تو کہا گیا ہے کہ نبی کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی الگ الگ ہیں اور اسلام کی دعوت صرف حیثیتِ نبوی کی اطاعت کی طرف ہے نہ کہ حیثیتِ شخصی کی اطاعت کی طرف۔ لیکن دوسرے مضمون میں اس بات سے انکار کیا گیا ہے کہ نبی کی یہ دو حیثیتیں الگ الگ ہیں اور پورے اصرار کے ساتھ کہا گیا ہے کہ نبی کی ایک ہی حیثیت تھی اور وہ تھی صرف نبی ہونے کی حیثیت۔ ان دونوں باتوں میں توفیق و تطبیق کی کیا صورت ہے؟

علاوہ بریں میرے پہلے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" پر دمشق سے ایک صاحب نے کچھ سوالات کیے ہیں، جو المسلمون کے شمارہ ۷ میں درج ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان سوالات کا رخ استاذ محمد المنتصر الکتانی کی طرف ہے، جن کا جواب اگر شائع ہو جائے تو انشاء اللہ میرے لیے بھی مفید ثابت ہوگا، لیکن چونکہ یہ سوالات میرے مضمون پر وارد کیے گئے ہیں، اس لیے مجھ پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ فاضل مستفسر کی تشفی کی کوشش کروں۔

یہ دونوں اعتراضات چونکہ ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ایک ہی مختصر مضمون میں ان کا جواب دے رہا ہوں۔

دراصل اس مسئلے کے دو پہلو ہیں۔ ایک نظری، اس اعتبار سے کہ حقیقت نفس الامری کیا ہے؟ دوسرے عملی، اس لحاظ سے کہ جہاں تک نبی کی ذات سے ہدایت اخذ کرنے کا تعلق ہے، آیا وہ ہمارے لیے پورا

کا پورا نبی اور صرف نبی ہے یا ہم اس کی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے صرف اس کی حیثیتِ نبوی کا اتباع اور اسی کی اطاعت کریں گے اور حیثیتِ شخصی کو چھوڑ دیں گے؟

اب پہلے نظری پہلو کو لیجیے۔ قرآن مجید اس معاملہ میں بالکل واضح ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں فرق ہے۔ وہ انسانوں کو اپنا بندہ بنانے کے لیے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بنانے کے لیے بھیجے جاتے تھے، مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ "کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تو اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو" (آل عمران ۷۹)۔ ان کے سپرد دو فریضے ایک ساتھ کیے جاتے تھے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو ہر غیر اللہ کی بندگی سے نکالیں، جس میں دوسری سب مخلوقات کے ساتھ ان کی اپنی ذات بھی شامل تھی۔ دوسرے یہ کہ ان کو صرف ایک اللہ کی بندگی میں داخل کریں:

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل ۳۶)

ہم نے ہر قوم میں (یہ پیغام دے کر) ایک رسول بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے الگ رہو۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران ۶۴)

کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے۔

دین میں ان کی بے چون و چرا اطاعت کا جو حکم دیا گیا، وہ ان کے ذاتی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ صرف اس بنا پر تھا کہ رسول ہی وہ شخص ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنی مرضی ظاہر فرماتا اور اپنے احکام بھیجتا ہے۔ اسی وجہ سے رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت قرار دی گئی ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (النساء: ۶۴)

ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، اسی لیے بھیجا ہے کہ اذنِ خداوندی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

اور:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللہَ (النساء۔ ۸) جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔

اس کے ساتھ یہ امر بھی قرآن اور بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ جو بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے نہیں بلکہ اپنی رائے سے کی یا کہی ہے اس میں بے چون وچرا اطاعت کا وہ مطالبہ آپ نے کبھی نہیں کیا جو امرالٰہی کے تحت کوئی کام کرنے یا کوئی بات کہنے کی صورت میں کیا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں میں نے اپنے مضمون "آزادی کا اسلامی تصور" میں پیش کی ہیں خصوصاً حضرت زید کا حضورؐ کے منع فرمانے کے باوجود سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینا اور اللہ اور اس کے رسول کا ان پر کوئی نکیر نہ کرنا تو اس کی صریح مثال ہے جس کی کوئی توجیہ اس کے سوا نہیں کی جاسکتی جو میں نے اپنے اس مضمون میں کی ہے۔ اور تابیرِ نخل والے معاملے میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اس مسئلے کو بالفاظِ صریح فرما چکے ہیں:

انما انا بشر اذا امرتکم بشیءٍ من دینکم فخذوا بہ واذا امرتکم بشیءٍ من رأیی فانما انا بشر ـــــ انما ظننت ظناً فلا تؤاخذونی بالظن ولکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ ـــــ انتم اعلم بامر دنیاکم (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب وجوب امتثال ما قالہ شرعاً دون ما ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم من معایش الدنیا علی سبیل الرأی)

میں بھی ایک انسان ہی ہوں، جب میں تم کو تمہارے دین کے متعلق کوئی حکم دوں تو اسے مانو اور جب میں اپنی رائے سے کچھ کہوں، تو بس میں بھی ایک انسان ہی ہوں ـــــ میں نے اندازہ سے ایک بات کہی تھی۔ تم میری اُن باتوں کو نہ لو، جو گمان اور رائے پر مبنی ہوں۔ ہاں جب میں خدا کی طرف سے کچھ بیان کروں تو اس کو لے لو، اس لیے کہ میں نے خدا پر کبھی جھوٹ نہیں باندھا ـــــ تمہیں اپنے دنیوی معاملات کا زیادہ علم ہے۔

یہ تو ہے نظری اور اصولی فرق۔ اب اس کے عملی پہلو کو لیجیے۔

دراصل یہ ایک بڑا نازک اور پیچیدہ معاملہ تھا کہ ایک بشر کو اللہ تعالیٰ اپنا واحد نمائندہ بنا کر انسانوں کے

درمیان اس دوہری خدمت پر مامور نہ ملتے کہ ایک طرف تو وہ بشر اپنے ابنائے نوع کو اپنی شخصیت سمیت تمام مخلوقات کی بندگی سے آزاد کرے اور خود اس آزادی کی انہیں تربیت دے، اور دوسری طرف وہی بشر ان سے اللہ کی مکمل، بے چون وچرا اطاعت کرائے اور اس اطاعت کا مرجع بھی تمام عملی اغراض کے لیے اس بشر کی اپنی ہی ذات من حیث الرسول ہو۔ یہ دو متضاد کام ایک ہی شخصیت کو بیک وقت کرنے تھے اور ان کے حدود ایک دوسرے کے ساتھ اتنے گتھے ہوئے تھے کہ خود اللہ اور اس کے رسول کے سوا کوئی دوسرا ان کے درمیان خطِ امتیاز نہ کھینچ سکتا تھا۔

اس معاملہ کی نزاکت اور پیچیدگی اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ہم تین باتوں پر غور کرتے ہیں:

اوّل یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت احکامِ الٰہی کے تحت اپنی اطاعت کراتے تھے اُس وقت تو ظاہر ہی ہے کہ آپ ایک وظیفۂ رسالت انجام دیتے تھے، مگر جس وقت آپ اپنے انتہائی اطاعت گزار متبعین کو خود اپنی ذات کی ذہنی غلامی سے آزاد کر کے حریتِ فکر و رائے کی تربیت دیتے تھے، جب آپ اُن کو اپنی شخصی آراء کے مقابلے میں اختلاف کی ہمت دلا کر تمام انسانوں کے سامنے استقلالِ فکر برتنا سکھاتے تھے، اور جب آپ اپنی حیثیتِ شخصی اور حیثیتِ نبوی میں خود ایک خطِ امتیاز کھینچ کر بتاتے تھے کہ یہاں تم آزاد ہو اور یہاں تمہارے لیے سمع وطاعت کے سوا چارہ نہیں ہے، اُس وقت بھی دراصل آپ وظیفۂ رسالت ہی کا ایک حصہ ادا فرماتے تھے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر ہمارے لیے آپ کی حیثیتِ شخصی اور حیثیت نبوی کے فرق کو سمجھنا اور عملاً ان دونوں حیثیتوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ دونوں حیثیتیں ایک دوسرے سے اس طرح ملی جُلی نظر آتی ہیں کہ ان کے درمیان صرف نظری فرق رہ جاتا ہے، عملاً اپنی شخصی حیثیت میں بھی کام کرتے وقت آپ نبوت ہی کا ایک کام کرتے پائے جاتے ہیں۔

ثانیاً، جو معاملات بظاہر بالکل شخصی معاملات ہیں، مثلاً ایک انسان کا کھانا، پینا، کپڑے پہننا، نکاح کرنا، بیوی بچوں کے ساتھ رہنا، گھر کا کام کاج کرنا، غسل اور طہارت اور رفعِ حاجت وغیرہ، وہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں خالص نجی نوعیت کے معاملات نہیں ہیں، بلکہ انہی میں شرعی حدود اور طریقوں اور آداب کی تعلیم بھی ساتھ ساتھ شامل ہے، اور آدمی کے لیے خود یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان میں کہاں حیثیت

رسالت ختم ہوتی ہے اور حیثیت شخصی شروع ہو جاتی ہے۔

ثالثاً، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ نبی کی ذات بحیثیت مجموعی ایک اسوہ ہے جس کا ہر پہلو اور ہر رُخ ہمیں ہدایت کی روشنی دیتا ہے اور اس ذات کا کوئی فعل اور قول بھی ہوائے نفس یا ضلالت و غوایت سے ذرہ برابر بھی آلودہ نہیں ہے:

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب۔ ۲۱)	تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین اسوہ ہے
یا ایھا النبی انا ارسلناك شاھداً ومبشراً ونذیراً وداعیاً الی اللہ باذنہ وسراجاً منیراً (الاحزاب ۴۵-۴۶)	اے نبی ہم نے تمہیں (لوگوں کے لیے) گواہ اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور اللہ کے اذن سے اللہ کی طرف بلانے والا اور ایک روشن چراغ بنایا ہے۔
ما ضل صاحبکم وما غویٰ وما ینطق عن الھویٰ، ان ھو الا وحی یوحیٰ۔ (النجم ۲، ۳، ۴)	تمہارا صاحب (یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نہ بدراہ ہوا اور نہ گمراہ ہوا اور جو کچھ وہ کہتا ہے، ہوائے نفس کی بنا پر نہیں کہتا۔ اس کی بات کچھ نہیں ہے مگر وحی جو اس پر نازل کی جاتی ہے

ان وجوہ سے نہ تو عملاً ہمارے لیے یہ ممکن ہے اور نہ شرعاً ہم اس کے مجاز ہیں کہ بطور خود ہم نبی کی حیثیت شخصی اور حیثیت نبوی میں فرق کریں اور آپ ہی آپ اس کے حدود متعین کریں، اور خود ہی یہ بھی طے کریں کہ فلاں امور آپ کی حیثیت نبوی کے تحت تھے جن میں ہم آپ کی اطاعت کریں گے اور فلاں شخصی حیثیت میں تھے جن میں ہم آپ کے اتباع اور اطاعت سے آزاد ہیں۔ اس فرق کے معلوم ہونے کا ذریعہ یا تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تصریح ہو سکتی ہے، یا پھر وہ اصولِ شریعت جو آپ ہی کی دی ہوئی تعلیمات سے مستنبط ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں کہ صحابۂ کرام اپنی رائے ظاہر کرنے سے پہلے آپ سے دریافت کر لیتے تھے کہ آپ کا ارشاد یا عمل حکم الٰہی کی بنا پر ہے یا اپنی ذاتی رائے پر، اور جب معلوم ہو جاتا تھا کہ وہ آپ کی ذاتی رائے سے ہے، تب وہ اپنی بات عرض کرتے تھے۔ چنانچہ غزوۂ بدر میں حضرت حباب بن المنذر نے اپنی رائے پیش کرنے سے پہلے پوچھ لیا کہ اس مقام کا انتخاب وحی کے

ذریعے سے کیا گیا ہے جس سے آگے بڑھنا یا پیچھے ہٹنا ہمارے لیے جائز نہیں ہے، یا یہ محض ایک تدبیرِ جنگ کے طور پر ہے؟ اسی طرح غزوۂ خندق میں حضرت سعد بن معاذ نے بنی غطفان سے صلح کی تجویز پر اظہارِ رائے کرنے سے پہلے دریافت کر لیا "اے اللہ کے رسول! کیا یہ ارادہ وحی کی بنا پر فرمایا گیا ہے کہ اس میں ہمارے لیے مجالِ کلام نہیں ہے، یا حضور صرف اپنی رائے سے ایسا کرنا چاہتے ہیں؟"

اور بعض اوقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی یہ ظاہر فرما دیتے تھے کہ فلاں بات آپ اللہ کی طرف سے ایک حکمِ دینی کے طور پر نہیں فرما رہے ہیں بلکہ اپنی شخصی رائے ظاہر فرما رہے ہیں، جیسا کہ اوپر تابیرِ نخل کے معاملہ میں حضورؐ کے ارشادات گزر چکے ہیں۔

اور بعض اوقات معاملہ کی نوعیت ہی ایسی ہوتی تھی جس سے خود بخود یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حضورؐ کا ارشاد اپنی شخصی حیثیت میں ہے۔ مثلاً حضرت زید سے آپ کا فرمانا کہ اَمسِكْ علیكَ زوجكَ واتقِ اللہَ "اپنی بیوی کو طلاق نہ دو اور اللہ سے ڈرو"۔ اس ارشاد کے متعلق یہ بات ظاہر تھی کہ یہ ایک مومن کو نبی کا حکمِ شرعی نہیں ہے بلکہ ایک خاندان کے فرد کو بزرگِ خاندان کا مشورہ ہے۔ اسی وجہ سے حضرت زیدؓ نے حضور کے ارشاد کے باوجود حضرت زینب کو طلاق دی اور اللہ اور اس کے رسول نے اس پر کوئی نکیر نہ کرنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ حضرت زیدؓ نے آپ کے فرمان کی نوعیت ٹھیک مشخص کی تھی۔

یہ تو وہ مثالیں ہیں جو حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں پیش آئی تھیں۔ ان کے علاوہ متعدد معاملات ایسے ہیں جن میں اب بھی اصولِ شریعت کی روشنی میں اس فرق کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً حضورؐ کے لباس اور آپ کے کھانے کے معاملہ کو لیجیے۔ اس کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ آپ ایک خاص وضع اور قطع کا لباس پہنتے تھے جو عرب میں اس وقت پہنا جاتا تھا اور جس کے انتخاب میں آپ کے شخصی ذوق کا دخل بھی تھا۔ اسی طرح آپ وہی کھانے کھاتے تھے جیسے آپ کے عہد میں اہلِ عرب کے گھروں میں پکتے تھے اور ان کے انتخاب میں بھی آپ کے اپنے ذوق کا دخل ہوتا تھا۔ دوسرا پہلو یہ تھا کہ اسی کھانے اور پہننے میں آپ اپنے عمل اور قول سے شریعت کے حدود اور اسلامی آداب کی تعلیم دیتے تھے۔ اب یہ بات خود حضور ہی کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے ہم کو معلوم ہوتی ہے کہ ان میں سے پہلی چیز آپ کی شخصی حیثیت سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری چیز حیثیتِ نبویہ سے

اس لیے کہ شریعت نے جس کی تعلیم دینے کے لیے آپ اللہ کی طرف سے مامور کیے گئے تھے، انسانی زندگی کے اس معاملہ کو اپنے دائرہ عمل میں نہیں لیا ہے کہ لوگ اپنے لباس کس تراش خراش اور وضع قطع پر سلوائیں، اور اپنے کھانے کس طرح پکائیں، البتہ اس نے یہ چیز اپنے دائرہ عمل میں لی ہے کہ کھانے اور پہننے کے معاملے میں حرام اور حلال اور جائز اور ناجائز کے حدود متعین کرے اور لوگوں کو اُن آداب کی تعلیم دے جو اہلِ ایمان کے اخلاق و تہذیب سے مناسبت رکھتے ہیں۔

یہ فرق خواہ ہم کو حضورؐ کی تصریح سے معلوم ہو یا آپ کے سکھائے ہوئے اصولِ شریعت سے، بہرحال اس کے علم کا ذریعہ نبی کی تعلیم ہی ہے۔ گویا ہم آپ کی حیثیتِ شخصیہ کے کام کو متعین کرنے کے لیے بھی آپ کی حیثیتِ نبویہ ہی کی طرف رجوع کریں گے۔ حیثیتِ شخصیہ سے براہِ راست ہمارا کوئی معاملہ نہیں ہے جو آپ کی حیثیتِ نبویہ کو نظر انداز کر کے ہم کر سکتے ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر میں نے اپنے دوسرے مضمون "اتباع و اطاعتِ رسول" میں منکرینِ سنت کو متنبہ کیا ہے۔ ان کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ وہ محمدؐ بن عبداللہ باعتبارِ رسول اور محمد بن عبداللہ باعتبارِ انسان میں خود تفریق کر کے ان دونوں حیثیتوں کے کاموں میں ایک خطِ امتیاز کھینچ دیتے ہیں اور آپ کی زندگی کے جس دائرے کو وہ خود آپ کی حیثیتِ رسالت سے الگ سمجھ بیٹھے ہیں، اس کے اتباع و اطاعت سے خود ہی انہوں نے آزادی اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ حضورؐ کی شخصی اور نبوی حیثیتوں میں حقیقت کے اعتبار سے جو بھی فرق ہے، وہ عنداللہ و عندالرسول ہے اور ہمیں اس سے صرف اس لیے آگاہ کیا گیا ہے کہ ہم کہیں عقیدے کی گمراہی میں مبتلا ہو کر محمد بن عبداللہ کو اللہ کے بجائے مطاعِ حقیقی نہ سمجھ بیٹھیں۔ لیکن امت کے لیے تو عملاً آپ کی ایک ہی حیثیت ہے اور وہ ہے رسول ہونے کی حیثیت۔ حتیٰ کہ محمد بن عبداللہ کے مقابلے میں اگر ہم کو آزادی حاصل بھی ہوتی ہے، تو وہ محمد رسول اللہ کے عطا کرنے سے ہوتی ہے اور محمد رسول اللہ ہی اس کے حدود متعین کرتے ہیں اور اس آزادی کے استعمال کی تربیت بھی ہم کو محمد رسول اللہ ہی نے دی ہے۔ ان توضیحات کے بعد اگر میرے دونوں مضمونوں کو ملاحظہ کیا جائے تو کوئی غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی۔

رسائل و مسائل

ختمِ نبوّت

سوال۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کا متفق علیہ عقیدہ یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں اور آپ کے بعد کوئی نیا نبی آنے والا نہیں ہے۔ تاہم مرزا غلام احمد صاحب قادیانی اور قادیانی جماعت کی بعض باتیں مجھے اچھی معلوم ہوتی ہیں۔

مثلاً مرزا صاحب کا چہرہ میری نظر میں معصوم اور بچوں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ کیا ایک جھوٹے اور چالاک آدمی کا چہرہ ایسا ہو سکتا ہے؟ ان کی پیشین گوئیاں بھی سوائے نکاح آسمانی اور اسی طرح کی چند ایک خبروں کے بڑی حد تک پوری ہوئیں۔ ان کی جماعت بھی روز بروز ترقی پر ہے اور اس میں اپنے زعومات کے لیے بڑا جوش اور ایثار پایا جاتا ہے۔

یہ ساری چیزیں خلجان میں ڈالتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے اطمینانِ قلب کی خاطر اس مسئلے کی ایسی وضاحت کر دیں جس سے تردد اور پریشانی رفع ہو جائے، اور حق و باطل کے مابین واضح امتیاز قائم ہو جائے۔

جواب: آپ نے مرزا غلام احمد صاحب کے معاملہ میں اپنے خلجان کے جو وجوہ بیان کیے ہیں ان کو درحقیقت کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے اور نہ ایک مدعیٔ نبوت کا دعویٰ ان بنیادوں پر کبھی جانچا جا سکتا ہے بلکہ میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے بھی زیادہ قوی وجوہ ان کے دعوے کو قابلِ غور سمجھنے کے لیے موجود ہوتے تب بھی وہ التفات کا مستحق نہ تھا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اور حدیث، دونوں کی رُو سے نبوت کا معاملہ دین میں اساسی حیثیت رکھتا ہے، یعنی اس پر آدمی کے کفر و ایمان کا مدار اور آخرت میں اس کی فلاح و خسران کا انحصار ہے۔ اگر آدمی ایک سچے نبی کو نہ مانے تو کافر، اور جھوٹے نبی کو مان لے تو کافر۔ اس طرح کی اہمیت اور نزاکت رکھنے والے

کسی معاملے کو بھی اللہ اور اس کے رسول نے مبہم اور پیچیدہ اور مشکوک نہیں رکھا ہے، بلکہ صاف اور واضح طریقہ سے رہنمائی دی ہے تاکہ انسان کا دین و ایمان خطرے میں نہ پڑے اور اس کے گمراہ ہونے کی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر نہ عائد ہو۔ اب دیکھیے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کبھی کسی نبی کے زمانہ میں یہ نہیں کہا گیا کہ نبوت کا سلسلہ بند ہو گیا ہے اور اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ تھے کہ انبیاء کی آمد کا دروازہ اس وقت کھلا ہوا تھا، کوئی شخص اس بنیاد پر کسی مدعی نبوت کا انکار کر دینے میں حق بجانب نہ تھا کہ اب کسی نبی کے آنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ پھر اس زمانے میں انبیاء علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبیوں کی آمد کے لیے پیش گوئی بھی کرتے رہتے تھے اور اپنے پیروؤں سے عہد لیتے تھے کہ بعد میں جو نبی آئیں ان کی بھی وہ پیروی کریں۔ یہ چیز اور بھی اس بات کو موکد کر دیتی تھی کہ جو شخص نبی کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرے اسے بلا تامل رد نہ کر دیا جائے بلکہ اس کی دعوت اور شخصیت اور اس کے کام اور احوال کو بنظر غائر دیکھ کر جاننے کی کوشش کی جائے کہ آیا وہ واقعی نبی ہے یا جھوٹا مدعی نبوت ہے۔ لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد یہ معاملہ بالکل الٹ ہو گیا۔ اب صرف یہی نہیں کہ آنحضرتؐ نے کسی نبی کی آمد کی پیش گوئی نہیں کی اور نہ اپنی امت سے اس کے اتباع کا عہد لیا، بلکہ اس کے برعکس قرآن میں اعلان کیا گیا کہ آنحضورؐ خاتم النبیین ہیں، اور آنحضورؐ سے ایک دو نہیں بلکہ متعدد حدیثیں نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں بکثرت مستند و معتبر واسطوں سے امت کو ملیں کہ اب نبوت کا دروازہ بند ہے، اب کوئی نبی آنے والا نہیں، اب جو مدعی نبوت اٹھیں گے وہ دجّال ہوں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اب اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی نگاہ میں لوگوں کے کفر و ایمان کا معاملہ نازک اور اہم نہیں رہا؟ کیا حضورؐ سے پہلے ہی کے مومنین اس کے مستحق تھے کہ انہیں کفر کے خطرے میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول واضح طور پر باب نبوت کے مفتوح ہونے اور انبیاء کی آمد کے متعلق خبریں دینے کا اہتمام فرماتے رہے، مگر اب ہمیں انہوں نے جان بوجھ کر اس خطرے میں مبتلا کیا ہے کہ ایک طرف تو نبی کے آنے کا امکان بھی ہو جس کے ماننے یا نہ ماننے پر ہمارے کافر یا مومن ہونے کا انحصار ہے۔ اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول نے صرف اتنے پر ہی اکتفا نہ کیا ہو کہ ہمیں اس کی آمد سے آگاہ نہ کیا، بلکہ اس سے گزر کر پے در پے وہ ایسی باتیں ارشاد فرماتے چلے گئے جن کی بنا پر ہم باب نبوت کو بند سمجھیں

اور مدعیٔ نبوت کو ماننے سے انکار کر دیں؟ کیا آپ کی عقل میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ اور اس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ہم سے ایسی دھوکہ بازی کر سکتے ہیں؟

خاتم النبیین کے معنی کی جو تاویل بھی قادیانی چاہیں کرتے رہیں، مگر کم از کم ایک بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ اس کے معنی سلسلۂ نبوت کو ختم کرنے والے کے بھی ہو سکتے ہیں اور امت کے ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نو سو ننانوے فی کروڑ علماء اور عوام اس کے یہی معنی لیتے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ نبوت جیسے نازک معاملے میں جس پر مسلمانوں کے کفر و ایمان کا مدار ہے، کیا اللہ میاں کو ایسی ہی زبان استعمال کرنی چاہیے تھی جس سے چند قادیانیوں کے سوا ساری امت یہی سمجھے کہ اب کوئی نبی آنے والا نہیں ہے؟ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے ارشادات تو کسی تاویل کی گنجائش بھی نہیں چھوڑتے۔ ان میں تو صاف صاف مختلف طریقوں سے اس بات کو کھول کر یہی کہہ دیا گیا ہے[1]۔ کیا اللہ کے رسول کو ہم سے ایسی ہی دشمنی تھی کہ نبی تو آپ کے بعد آنے والا ہو اور آپ ہمیں اُلٹی یہ ہدایت دے جائیں کہ ہم اسے نہ مانیں اور کافر ہو کر جہنم میں جائیں؟

ان امور پر اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو اطمینان ہو جائے گا کہ فی الواقع نبوت کا دروازہ بند ہے اور اب کسی نبی کے آنے کا امکان نہیں ہے۔ اس صورت میں کوئی شخص چاہے کیسی ہی بھولی بھالی دل موہنے والی صورت رکھتا ہو اور خواہ اس کی پیشین گوئیاں سو فیصد درست ہوں اور خواہ اس کے کارنامے کیسے ہی ہوں، ہم اس کے دعوائے نبوت کو قابل غور بھی نہیں سمجھتے کیونکہ یہ چیزیں غور طلب صرف اسی صورت میں ہو سکتی تھیں جبکہ نبی کی آمد کا امکان ہوتا۔ ہم تو پورے اطمینان کے ساتھ ہر مدعی نبوت کے دعوے کو سنتے ہی اس کی تکذیب کریں گے اور اس کے دلائل نبوت پر سرے سے کوئی توجہ نہ دیں گے۔ یہ اگر کفر بھی ہو تو ہم پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، کیونکہ ہمارے پاس قیامت کے روز اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے قرآن اور ارشاداتِ رسول موجود ہیں۔

---

[1] مثال کے طور پر اس ارشاد ہی کو لیجیے جس میں سلسلۂ نبوت کو ایک قصر سے تشبیہ دی گئی ہے، ہر نبی کو عمارت کی ایک اینٹ قرار دیا گیا ہے اور آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس عمارت میں اب صرف ایک اینٹ کی گنجائش تھی اور وہ آخری اینٹ میں ہوں۔

مسئلہ حیاتُ النّبی

سوال - آج کل دینی حلقوں کی فضا میں حیات النبی کا مسئلہ ہر وقت گونجتا رہتا ہے اور علمائے کرام کے نزدیک موضوعِ سخن بنا ہوا ہے۔ شروع میں تو فریقین اپنی اپنی تائید میں علمی دلائل دے رہے تھے مگر اب تکفیر بازی، طعن و تشنیع اور پگڑی اچھالنے تک نوبت پہنچ گئی ہے۔ الا ماشاء اللہ

بعض مساجد میں بآوازِ بلند کہا جارہا ہے کہ انبیاء اسی طرح زندہ ہیں جس طرح کہ دنیا میں زندہ تھے اور حیاتُ النبی کا منکر کافر ہے۔ بعض دوسرے حضرات حیاتِ جسمانی کے عقیدے کو مشرکانہ بلکہ منبع شرک قرار دے رہے ہیں۔ جہاں تک فضائل کا تعلق ہوتا ہے وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ بات جو قرآن کریم اور خبرِ متواتر کے خلاف نہ ہو مانی جاسکتی ہے۔ لیکن جب بات عقیدہ کی حد تک پہنچ جائے تو وہاں قطعی الثبوت دلائل کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ براہ کرم میرے دل کی تسلی اور تشفی کے لیے مسئلہ حیات النبی پر روشنی ڈالیں۔

جواب : مسئلہ حیات النبیؐ کے بارے میں آج کل جس طریق پر علمائے کرام کے مابین بحث چل رہی ہے اس کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی اس کا کچھ حاصل ہے۔ عقیدے کی حد تک ہمارا اس بات پر ایمان کافی ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نبی ہیں اور آپ کی ہدایت ابد تک کے لیے کامل ہدایت ہے عمل کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ ہم آنحضورؐ کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کریں جسے معلوم کرنے کی خاطر قرآن اور سنت ہمارا مرجع و منبع ہے۔ اب آخر اس بحث کی حاجت ہی کیا ہے کہ نبی کریم اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کس معنیٰ میں زندہ ہیں۔ برزخی و روحانی حیات ہو یا جسمانی حیات، بہرحال اس امرِ واقعہ سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آنحضرتؐ کا سلہ ھ میں وصال ہوچکا ہے، امت کی ہدایت کے لیے آپ بنفسِ نفیس ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، اور آپ کا اتباع کرنے کے لیے ہمیں آپ کی ذاتِ اقدس کی طرف رجوع کرنے کے بجائے قرآن اور حدیث ہی کی طرف رجوع کرنا ہے۔ حیاتِ برزخی یا حیاتِ جسمانی کی بحث کا کوئی بھی فیصلہ ہو، اس سے اس امرِ واقعہ میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔

پھر یہ بحث اس لیے بھی غیر ضروری اور لاطائل ہے کہ ہم اس خاص معاملے میں کوئی متعین عقیدہ رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے مکلف ہی نہیں کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی مسلمان اس مسئلے سے بالکل خالی الذہن ہو، یا اس میں کوئی رائے قائم کیے بغیر مر جائے، تو اس کے ایمان میں کوئی نقص واقع نہ ہوگا، نہ آخرت میں اس سے پوچھا جائے گا کہ تو نے حیات نبی کے برزخی یا جسمانی ہونے کے بارے میں کیا عقیدہ رکھا تھا۔ قرآن و حدیث میں کوئی ایسی واضح اور قطعی ہدایت اس باب میں نہیں دی گئی جو ہمیں ایک خاص عقیدہ رکھنے کا پابند کرتی ہو، نہ یہ مسئلہ صحابۂ کرام کے درمیان زیر بحث تھا، نہ آنحضورؐ کے جانشینوں نے کسی کو اس معاملے میں کوئی خاص عقیدہ رکھنے کی کبھی تلقین کی۔

میں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ حیات النبی کے مسئلے میں حضرات علماء وہی غلطی کر رہے ہیں جو خلق قرآن کے مسئلے میں خلیفہ مامون نے کی تھی۔ یعنی جس چیز کو اللہ اور اس کے رسولؐ نے اسلام کا ایک عقیدہ اور ایمانیات کا ایک رکن نہیں قرار دیا تھا اور نہ جسے ماننے یا نہ ماننے پر آدمی کی نجات کا مدار رکھا تھا اور نہ جس پر اعتقاد رکھنے کی خلق کو دعوت دی تھی، اسے خواہ مخواہ عقیدہ اسلام اور رکنِ ایمان بنایا جا رہا ہے، اس کے ماننے یا نہ ماننے پر مدار نجات رکھی جا رہی ہے، اس پر اعتقاد رکھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اور اعتقاد نہ رکھنے والوں کی تکفیر و تفسیق کی جا رہی ہے۔ دین میں جن چیزوں کی یہ حیثیت تھی ان کو صاف صاف اور حتمی طور پر بیان کر دینے میں اللہ اور اس کے رسول نے کوئی کوتاہی نہیں کی ہے اور علی رؤس الاشہاد ان کی طرف دعوت دی ہے۔ یہ مسئلہ ہرگز ان مسائل میں سے نہیں ہے اور اسے زبردستی ان مسائل میں شامل کرنا یا ان کا سا درجہ دینا کلیتہً غلط کارروائی ہے۔ اگر کوئی شخص اس مسئلے میں قطعاً خالی الذہن ہو یا اس کے بارے میں کوئی عقیدہ و رائے نہ رکھتا ہو اس سے قیامت میں کوئی باز پرس نہ ہوگی اور اس کے انجام اخروی پر اس عدم رائے یا خلوئے ذہن کا کوئی اثر مترتب نہ ہوگا۔ البتہ خطرے میں وہ شخص ہے جو اس مسئلے میں ایک عقیدہ قائم کرتا اور اس کی تبلیغ کرتا ہے کیونکہ اس کے عقیدے میں صحت اور عدمِ صحت دونوں کا احتمال ہے۔

مطبوعات

ماہنامہ عروجِ اسلام لاہور | مدیر مسئول: جناب میاں محمد نوشہروی صاحب۔ سالانہ چندہ پانچ روپے۔ فی پرچہ ۸ آنے۔ مقام اشاعت: ادارۂ عروجِ اسلام حسین آباد، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

اس رسالہ کے مدیر ایک صاحب جذبہ بزرگ ہیں وہ عرصہ دراز سے پرویز صاحب کے افکار و نظریات پر تنقید فرما رہے ہیں۔ اب انہوں نے اسی مقصد کے لیے یہ رسالہ جاری کیا ہے۔ ہمارے سامنے اس وقت اس کا دوسرا شمارہ ہے۔ اس کے چند عنوانات یہ ہیں: احوال و کوائف مودودی اور پرویز، وضو میں پاؤں دھونے کا حکم، حقیقی اسلام۔ جو حضرات اس قسم کے مباحث سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اسے مندرجہ بالا پتہ سے چندہ بھیج کر منگوا سکتے ہیں۔

ماہنامہ باغ و بہار لاہور | ترتیب دینے والے: ایچ۔ یو۔ خاں صاحب۔ مقبول جہانگیر صاحب۔ سالانہ چندہ چار روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ چھ آنے۔ مقامِ اشاعت ۱۱ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

بچوں کا یہ ماہنامہ بڑی امنگوں کے ساتھ جاری ہوا ہے۔ اس میں بچوں کے ذوق اور نفسیات کا پورا پورا خیال رکھتے ہوئے اس قسم کی معلومات اور کہانیاں جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں کے دل میں خدا خوفی، شرافت اور عزتِ نفس کا جذبہ پیدا ہو۔ پرچے کا ٹائیٹل دیدہ زیب ہے۔ البتہ کتابت اور طباعت میں بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے۔

(بقیہ اشارات)

جو شخص برتھ کنٹرول کے ذریعہ ملک کی آبادی کو روکنے کی تجویز پیش کرتا ہے کیا اس کے بارے میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ واقعی خدا کو اپنا رازق سمجھتا ہے اور رزق کے متعلق اللہ کے اُن سارے وعدوں پر جو اُس نے قرآن مجید میں کیے ہیں ایمان رکھتا ہے۔ ہم تو رزق کی کمی کو ضبطِ تولید سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اُس زندہ و پائندہ ذات نے جس کے اختیار میں کائنات کا ہر ذرہ ہے ہمیں یہ یقین دلایا ہے:

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ۔ (ہود-۱)	زمین میں چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو اور جس کے متعلق وہ نہ جانتا ہو کہ کہاں وہ رہتا ہے اور کہاں وہ سونپا جاتا ہے، سب کچھ ایک صاف دفتر میں درج ہے

رزق کی وسعت صرف محنت اور سرمایہ کے کامیاب تعامل کا ہی ثمرہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں خدا کا ارادہ اور مشیت بھی کام کرتی ہے۔ بندہ جب اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو وہ اسے ایسے ایسے راستوں اور طریقوں سے رزق بہم پہنچاتا ہے جس کا اُسے وہم و گمان نہیں ہوتا:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (الطلاق-۱)	اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے اُس کے لیے اُس کی گزران اور روزی کا اس طریق سے انتظام کیا جاتا ہے جس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ کرے تو وہ اس کے لیے کافی ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر بات ختم کرنے سے پیشتر ہم ایک امر کی وضاحت کر دیں۔ بعض لوگوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یورپ کی بیشتر قوموں میں یہ اخلاقی برائیاں تو بدرجہ اتم موجود ہیں لیکن ان کے باوجود وہ خوشحال اور فارغ البال ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رہے کہ اسلام کی نظر میں دنیا کی ظاہری کامیابی و خوشحالی یا مال و متاع کی فراوانی نہ خدا کی خوشنودی کا پروانہ ہے اور نہ کفر و عصیان کی سند۔ خدا کی خوشنودی اور غضب کی بھی کئی ایک صورتیں ہیں۔ وہ کبھی تو رزق کی تنگی کے ذریعہ اپنی ناراضگی کا اظہار کرتا ہے اور کبھی اسے ہی روحانی اور اخلاقی

ترقی کا زینہ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح جب کبھی فرد یا قوم کا طغیان و عصیان اور سرکشی و نافرمانی حد سے بڑھ جاتی ہے تو اس کی رسّی ڈھیلی کر دی جاتی ہے اور اُسے کہا جاتا ہے کہ "جاؤ جو جی میں آئے کر کے دیکھ لو"۔ پھر اسے ذلت کے عمیق گڑھے تک پہنچانے کے لیے ہر وہ چیز اُسے مہیا کی جاتی ہے جس سے اس کی سرکشی میں اضافہ ہو۔ جاہ و ثروت، مال و حیثیت، حکومت و سیاست، علوم و فنون سب اس کے قدموں میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔ تاکہ وہ برائی کرنے کے لیے اپنے دل کے سارے ارمان نکال لے۔ حضور سرورِ کائنات نے اس صورتِ حال کی توضیح میں ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم دیکھو کہ کوئی شخص گناہوں اور سرکشیوں میں بے باکی سے مبتلا ہے اور پھر بھی اللہ دنیا کی مرغوب و محبوب چیزیں جاہ و مال وغیرہ اس کو عطا فرما رہا ہے تو سمجھ لو یہ استدراج ہے۔ اس کے بعد حضورؐ نے سورہ انعام کی وہ آیات تلاوت فرمائیں جن میں خود اللہ تعالیٰ نے اس استدراج و تمہیل (یا ڈھیل) کے قانون کو بیان فرمایا ہے۔

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً فَإِذَا هُمْ مُبْلِسُونَ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا وَالْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔ (رکوع ۵)

پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو، جو انہیں کی گئی تھی، بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے اُن کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب حال یہ تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اسی طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جنہوں نے ظلم کیا تھا اور تعریف ہے اللہ رب العالمین کے لیے۔

مندرجہ بالا آیت اس حقیقت کی غمازی کرتی ہے کہ دولت کی فراوانی ہر حالت میں مُوجبِ خیر و برکت نہیں ہوتی بلکہ بسا اوقات اللہ تعالیٰ اسے آزمائش کا ذریعہ بناتا ہے۔ اس وقت دولت کی کثرت اور قلت نے نوعِ انسانی کے لیے جو عجیب و غریب الجھنیں اور پریشانیاں پیدا کر رکھی ہیں انھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملتِ اسلامیہ بلکہ پوری نوعِ بشری کا اصل مسئلہ ذرائع و وسائل کی کمی یا زیادتی نہیں

بلکہ اخلاق کا فقدان ہے ـــــ وہ اخلاق جس کا خمیر خشیتِ الٰہی سے اٹھایا جاتا ہے۔ انسان جب تک اپنے مالک کے ساتھ اپنے تعلق کو صحیح بنیادوں پر استوار نہیں کرتا وہ اپنے کسی مسئلہ کو کامیابی سے حل نہیں کر سکتا۔ خدا سے منہ موڑ کر وہ جتنے قدم بھی آگے بڑھاتا ہے اسی قدر اپنی پیچیدگیوں اور پریشانیوں میں اضافہ کرتا چلا جاتا ہے۔ ایک ناسور پر مرہم رکھتا ہے تو دس نئے ناسور رسنا شروع کر دیتے ہیں۔ انسان اپنی اس بے بسی پر حیران بھی ہے مگر وہ ابھی تک جان نہیں سکا کہ فساد کی اصل جڑ کہاں ہے۔ فطرت نوع بشری کی اس بے کسی کو دیکھ کر محو حیرت ہے اور یہ سوچ رہی ہے کہ آخر انسان کو کیا ہو گیا ہے کہ اشرف المخلوقات ہو کر بھی وہ اپنے خالق اور مالک کو پہچان نہیں سکتا۔ بالخصوص مسلمانوں کی یہ مادہ پرستانہ روش تو اس پر سخت شاق گزرتی ہے اور وہ اس حاملِ قرآن امت سے حیرت زدہ ہو کر سوال کرتی ہے :

أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ

"کیا اہلِ ایمان کے لیے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ اللہ کے ذکر اور اس کے حکمِ حق کے لیے ان کے اندر درد اور شکستگی پیدا ہو اور وہ اپنے پروردگار کے آگے جھک جائیں۔"

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ کی مطبوعات

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ نے جناب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے اُن کی حسبِ ذیل تصانیف کے جملہ حقوق حاصل کر لیے ہیں

۱ رسالہ دینیات
۲ خطبات
۳ اسلامی تہذیب اور اس کے اصول و مبادی
۴ اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر
۵ تفہیمات (حصہ اول)
۶ " (حصہ دوم)
۷ تنقیحات
۸ رسائل و مسائل (حصہ اول)
۹ " (حصہ دوم)
۱۰ " (حصہ سوم) زیر ترتیب
۱۱ قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں
۱۲ اسلام اور جدید معاشی نظریات
۱۳ سود
۱۴ مسئلہ ملکیت زمین
۱۵ تعلیمات
۱۶ پردہ
۱۷ حقوق الزوجین
۱۸ تجدید و احیائے دین
۱۹ مسئلہ جبر و قدر
۲۰ اسلام اور ضبطِ ولادت
۲۱ اسلام کا نظامِ حیات
۲۲ اسلامی دستور کی تدوین
۲۳ اسلامی قانون اور پاکستان میں اس کے نفاذ کی عملی تدابیر
۲۴ زندگی بعد موت
۲۵ اسلام اور جاہلیت
۲۶ اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر
۲۷ دینِ حق
۲۸ شہادتِ حق
۲۹ انسان کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل
۳۰ اسلام کا نظریہ سیاسی
۳۱ اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ؟
۳۲ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ
۳۳ مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل
۳۴ قرآن فہمی کے بنیادی اصول
۳۵ الجہاد فی الاسلام
۳۶ سلاجقہ
۳۷ تاریخ دکن
۳۸ مرتد کی سزا اسلامی قانون میں
۳۹ ذمیوں کے حقوق
۴۰ اسلامی نظامِ تعلیم
۴۱ اسلامک لاء اینڈ کانسٹی ٹیوشن (انگریزی)
۴۲ ٹوورڈس انڈر اسٹینڈنگ اسلام (انگریزی)